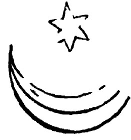
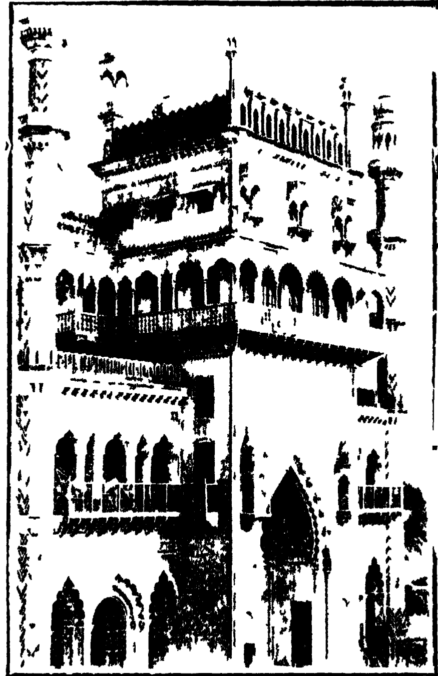
سوانح عمری
۸۳



بشیر پاشا سیریز



تذکرہ

جواد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر

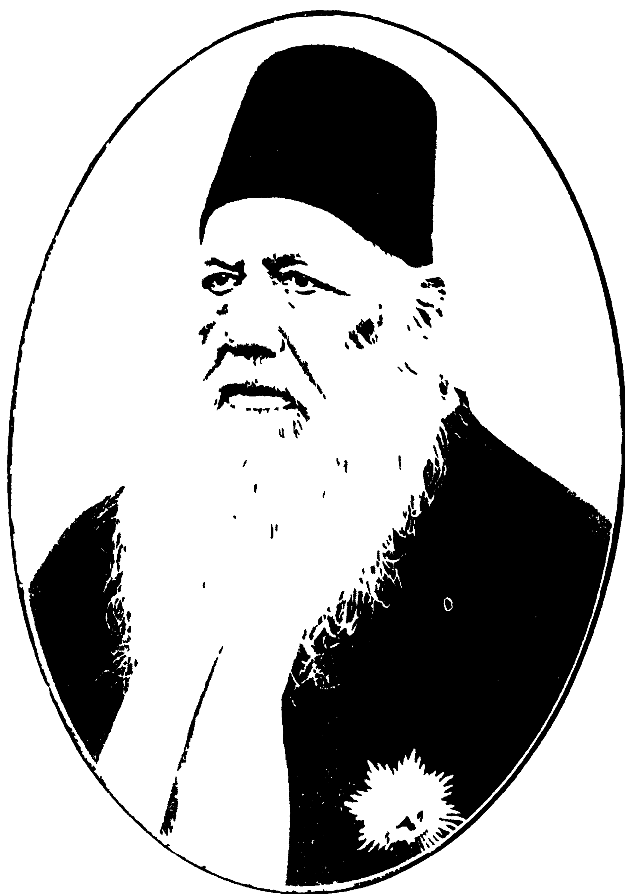
سرسید احمد خاں مرحوم

مرتبہ

نور الرحمن بی۔ اے

اسلامیہ ہائی اسکول (اٹاوہ)

Title and inside Blocks printed by Taj Printing Works Fort, Bombay



سید

یعنی

جوادالدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سید احمد خاں بہادر غفر لہٗ

کے، سی۔ ایس، آئی، سی، ایس، آئی۔ ال ال، ڈی

کی مختصر سوانح عمری

مرتبہ

مولوی نورالرحمن بی۔ اے (علیگ)

معنون

میں اس سلسلہ کو اپنے شاگرد رشید جوان مرگ بشیر پاشا
مرحوم بی۔ اے۔ بی ٹی کے نام سے معنون کرتا ہوں جس کی
زندگی اور جس کی تعلیم و تربیت کا مقصد قوم کی تعلیمی خدمت تھی۔
اور جس نے تکمیل تعلیم کر کے اپنی زندگی کو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ
کے لئے وقف کر دیا تھا۔

محمد الطاف حسین

شمسی مشین پریس آگرہ میں محمد بشیر الدین خاں کے اہتمام سے چھپایا گیا

تذکرۃ المشاہیر

نوجوانان قوم میں ملک اور قوم کی خدمتوں کا جذبہ پیدا کرنے اور اُن کے حوصلے بڑہانے کے لئے
ان مشاہیر قوم کی سوانح عمریوں کا مطالعہ جنہوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی ترقیوں میں جانفشانیاں
کی ہیں نہایت موثر ذریعہ ہے اور ہر ملک اور ہر قوم میں اس ذریعہ سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔
عظیم الاجمال کی بڑی بڑی سوانح عمریوں کے علاوہ خوشنما سائز اور عمدہ طباعت کے ساتھ کم قیمت
لائف اسکیچ بکثرت شائع کئے جاتے ہیں لیکن ہندوستان میں مسلمانوں نے اس ذریعہ پر کچھ توجہ
نہیں کی حالانکہ دوسری قومیں اسی ذریعہ سے بہت کچھ منافع حاصل کر رہی ہیں اسی مقصد کو
پیش نظر رکھ کر میں نے اور مولوی بشیرالدین صاحب منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نے ارادہ کیا ہے کہ
جہاں تک ممکن ہو اس عصر جدید میں جن مشاہیر نے اپنی عمریں قومی خدمت اور قومی ہمدردی
میں صرف کی ہیں ان کے لائف اسکیچ شائع کئے جائیں چنانچہ سردست اس سلسلہ کے چند نمبر
شائع کئے جاتے ہیں اور میں اُن عزیزوں اور دوستوں کا شکرگزار ہوں جنہوں نے ہماری دلی
خواہش کی تکمیل میں اپنا وقت صرف کر کے اور محنت اُٹھا کر ان تذکروں کو مرتب کیا ہے
خداوند تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ہم کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔
میں نیز پرجوش نوجوان دوست سید عبدالجلیل صاحب کا جو بمبئی میں فن طباعت کی تکمیل کر رہے ہیں خاص
طور پر شکرگزار ہوں کہ انہوں نے نہایت تنگ وقت میں تصاویر کے ایسے اچھے اور عمدہ بلاک خود تیار
کر کے بطور امداد عنایت کئے اور اپنی نگرانی میں اُن کو طبع کرایا۔
میں نیز اہل قلم نوجوانان قوم سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس قومی خدمت میں ہماری مدد کریں گے
عنداللہ ماجور ہوں۔ اس سلسلہ کی اشاعت سے اگر کچھ فائدہ ہوا تو اسی سلسلہ کی توسیع میں صرف ہوگا

محمد الطاف حسین بی اے
ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول



انتساب

اس مخلصانہ عقیدت کی بناپر جو مجھہ کو

خان بہادر مولوی بشیرالدین صاحب قبلہ

بانی اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کی ذات گرامی سے ہے،

اور اُن جلیل القدر خدمات قومی وتعلیمی کی ادنیٰ

اعتراف میں جو جناب ممدوح نے گذشتہ چالیس سال

میں انجام دی ہیں اِن اوراق کو اُن کے نام

نامی سے منسوب کرتاہوں

گر قبول افتد زہے عز و شرف



التماس

سرسید کی زندگی جن عظیم الشان کارناموں کا مرقع ہے اور انیسویں صدی کے انقلاب انگیز زمانہ میں جو حیثیت اُن کو حاصل تھی اُس کا مختصر تذکرہ بھی چند اوراق میں ممکن نہیں۔

گزشتہ پچاس سال میں جو حیرت انگیز انقلابات ہندوستان میں رونما ہوئے ہیں اُن کا زبردست اثر سرسید کی زندگی کی ہر منزل پر نظر آتا ہے، اور جب تک ان واقعات کا تفصیل سے ذکر نہ کیا جائے جو اُن کی قومی سیاسی مذہبی، اور تعلیمی خدمات کے محرک ہوئے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ سرسید کی حقیقی عظمت اور اُن کے کارناموں کی واقعی اہمیت واضح ہوسکے گی۔

سرسید جب مذہبی اصلاح پر متوجہ ہوئے تو مصر و ترکی میں یہ تحریک شروع ہو چکی تھی اور ہندوستان میں راجہ رام موہن رائے اور سوامی دیا نند وغیرہ اسی کام میں مصروف تھے جب علوم

مغربی کی اشاعت اور ترقی تعلیم کا اُن کو خیال ہوا تو اصلاح تعلیم کی کوششیں ہر طرف جاری تھیں، اُن کی سیاسی خدمات کی ابتدا اس وقت ہوئی کہ ہندوستان میں سیاسی بیداری شروع ہو گئی تھی اس لئے یہ ناممکن ہے کہ اُن کی سوانح عمری میں ان اہم تحریکوں کا ذکر نہ کیا جائے۔

اصلاح زبان و ترقی اردو، تصنیف و تالیف تقریر و تحریر، اصلاح معاشرت، انتظامی قوت اور دیگر خصوصیات بھی کافی شرح و بسط کی محتاج ہیں۔

اس لحاظ سے اُن کی سوانح عمری محض واقعات زندگی کا یکجا جمع کر دینا نہیں بلکہ اُن کے اہم کارناموں اور بعض خصوصیات پر مبسوط تنقید کا نام ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس مختصر کتاب سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا لیکن یہ توقع بیجا نہیں کہ شاید ان اوراق کی اشاعت کسی ایسی تصنیف کی محرک ہو سکے، اور اگر ایسا ہوا تو میں سمجھوں گا کہ یہ ناچیز خدمت بھی رائگاں نہ گئی۔

بچھراؤں
۲۴ر اکتوبر ۲۵ء

نور الرحمٰن

فہرست مضامین



ثقفیہ ۱۹۵۹
۷۹۳۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

باب اول

ابتدائی حالات، وملازمت

زوال سلطنت مغلیہ ایک تاریخی واقعہ ہے لیکن اُس کی اہمیت اثرات کو ظاہر کرنے کے لئے کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں ترکی (مغل) سلطنت نہیں ختم ہوئی بلکہ آفتاب مشرق غروب ہوگیا، شیرازہ اسلامی منتشر ہوگیا، ہندوستانی ذہنیت وحکمت فنا ہوگئی، مشرقی علوم وفنون غارت ہوگئے، بلند نظری علو ہمت کمالات ذاتی اور صفات انسانی زمین ہند کلیۃً محروم ہوگئی اور دنیا کی سب سے بڑی لعنت یعنی تیس کرور بندگان خدا کی غلامی ایک نامعلوم مدت کے لئے مسلط ہوگئی۔

یہ انقلاب حکومت کسی خارجی اثر یا بیرونی طاقت کے دباؤ سے نہیں
بلکہ تقدیر الٰہی کے زبردست قانون بقاے اصلح و انقلاب امم کے
غیر محسوس و غیر فانی عمل کا نتیجہ تھا اسی لئے محکوم و درماندہ ہندوستان
کے لئے یہ ناممکن تہا کہ وہ اسی زمانہ میں جبکہ یہ سب کچھ ہو رہا تھا
اسکے اصلی سبب کو بھی دریافت کر سکتا، ادراک و فہم اور اصابت رائے
کی قوت زائل ہو چکی تہی اور غالب طاقت کے پاس جو وسائل تھے وہ
فرسودہ مشرقی دماغوں کی رسائی سے یقیناً زیادہ بلند تھے، چنانچہ
حکومت کا ورق اُلٹ گیا، پھر بہی اہل ہند نہ اپنی کمزوری سے
واقف ہوے اور نہ یہ تمیز کر سکے کہ وہ کون قوت ہے جو پردہ زنگار
میں اِن کے خلاف کام کر رہی ہے عہد ایسٹ انڈیا کمپنی، ہنگامہ بغاوت
مذہبی تعصبات، ذاتی عناد و کدورت، عام افلاس، وجہالت نے
اہل ہند کو تنزل اس کی آخری حد پر پہنچا دیا تھا جس کے بعد تباہی
و بربادی کی کوئی منزل باقی نہیں رہتی۔ اس زمانہ میں کسی ہندوستانی کا
جو انہیں حالات اور اثرات کی گودوں میں پلا ہو اہل ہند کے
اصلی مرض کو تشخیص کر لینا اس کا معقول علاج تجویز کرنا اور اسکے لئے
ذرائع اور وسائل سے کام لینا جو غالب طاقت کی تدابیر کے ہم
پلہ ہوں بلاشبہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی مثال کیلئے ہندوستان کا

عہدِ عتیق نہیں، بلکہ آزاد قوموں کی تاریخ ہی ہماری رہنمائی کر سکتی ہے۔
سید احمد خاں ایسے ہی شخص تھے جن کی آنکھیں زوالِ سلطنت کی آخری گھڑیاں بھی دیکھ چکی تھیں، اور پھر جب آفتابِ اقبال غروب اور افقِ ہند بالکل تاریک ہوگیا تب بھی اُن کی آنکھیں کھلی رہیں، اور حتی المقدور وہ اپنے قوائے عملی و عقلی سے کام لیتے رہے۔

ولادت و خاندان | سید احمد خاں ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان سادات دہلی میں ہمیشہ سے ممتاز تھا۔ اُن کی ننھیالی بزرگ بسلسلہ تجارت دہلی آئے تھے۔ پھر یہیں سکونت اختیار کر لی۔ اُن کے حقیقی نانا خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر دبیرالدولہ، امین الملک، مصلح جنگ کے خطاب سے ممتاز اور سلطنت انگلشیہ کے معتمد و شاہ دہلی کے وزیر رہ چکے تھے علاوہ امورِ مہمہ متعلق انتظام سلطنت کے جن کو انہوں نے کمال لیاقت و خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ علم و فضل میں بھی خاص رتبہ رکھتے تھے اور بالخصوص علوم ریاضی و ہندسہ کے متبحر عالم تھے۔

سرسید کے والد میر متقی بھی قلعہ دہلی کے وظیفہ خوار اور درباریوں میں تھے۔ خود سرسید بھی آخری تاجدار دہلی کے دربار میں اکثر اپنے والد کے ہمراہ حاضر ہوتے تھے۔

میر متقی آزاد منش اور وضعدار آدمی تھے۔ دہلی کی گئی گذری شان میں جو صحبتیں اور جلسے باقی تھے اِن میں سے اکثر میں وہ شریک ہوتے تیراکی کے میلے اور تیر اندازی کے مقابلے اُن کے دم سے رونق پاتے اور ہمیشہ آزادی و بے فکری سے گذر کرتے۔ اسی وجہ سے اُن کی اولاد یعنی سید محمد و سید احمد اور لڑکیوں کی پرورش زیادہ تر ماں کے سایہ عاطفت میں ہوئی۔

سر سید کا خاندان شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معتقد تھا اور ان کی والدہ شاہ غلام علی صاحب کی مرید۔ یہی وجہ تھی کہ مذہبی امور میں اِن کا خاندان عام توہمات و بیجا تقلید اور رسم و رواج کی پابندی سے ہمیشہ آزاد رہا۔ سید نے خود بیان کیا ہے کہ "میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک و بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا۔

بچپن | سر سید اپنے گھر میں سب سے چھوٹے تھے، لیکن خاندان میں بہت سی بچے تھے جن کی وجہ سے کھیل کود کے لئے غیر بچوں کی ضرورت نہ تھی، نہ کہیں باہر آنا جانا تھا۔ اپنے ہی گھروں میں کھیلتے کودتے تھے۔ جس طرح عام شرفا کا دستور ہے کہ بچوں کو اپنے سامنے کھیل و تفریح کا موقع دیتے ہیں، سر سید کا خاندان بھی اِن کو آزادی سے

اپنے گھروں میں کھیلنے کی اجازت دیتا تھا۔ جب بڑے ہوئے تو والد سے تیراکی اور تیر اندازی کی مشق کی اور اس زمانہ کے جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ اسی زمانہ میں وہ دربار میں بھی جانے لگے اُن کے والد نے اپنا خلعت اِن کو دلوانا شروع کر دیا اور خود دربار کی حاضری کم کر دی۔

تعلیم | سرسید کی تقریب بسم اللہ کی مجلس میں حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے آپ ہی نے بسم اللہ پڑھائی۔ اس کے بعد اپنے گھر ہی میں قرآن شریف پڑھنا شروع کیا اور پھر مولوی حمید الدین سے کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں بعد اُن کے انتقال کے دوسرے اُستادوں سے فارسی میں گلستاں، بوستاں اور عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی اور مطول وغیرہ چند کتابیں دیکھیں، لیکن یہ بھی سرسری مطالعہ تھا، پھر اپنے خاندانی علم ریاضی کا شوق ہوا چند کتابیں علوم ریاضی و ہندسہ کی اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے پڑھیں، اس کے بعد حکیم غلام حیدر خاں سے طب شروع کی اور کچھ دنوں بعد اسکو بھی چھوڑ دیا۔ غرض اٹھارہ اُنیس برس کی عمر میں سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا، لیکن ذوق علم بدستور رہا عنفوان شباب میں دہلی کی رنگین صحبتیں

یا شعر و شاعری کے جلسے ہی کیا کم دلچسپ تھے کہ وہ علمی مشاغل کیطرف توجہ کرتے۔ کبھی کبھی صہبائی، غالب اور آزردہ کی صحبت رہتی، لیکن آخر آخر علمی مذاق ترقی کرتا رہا اور اسی کے ساتھ ان کی استعداد علمی میں اضافہ ہوتا گیا۔

ملازمت | جب سرسید کے والد کا انتقال ہوا تو قلعہ کی آمدنی اور تنخواہ بند ہو گئی سرسید کی عمر اس وقت بائیس سال کی قریب تھی ان کو ملازمت کی فکر ہوئی اور اپنے خالو مولوی خلیل اللہ خاں صدر امین دہلی کے پاس عدالت کا کام سیکھا اور پھر اُنہیں کے پاس سررشتہ دار ہو گئے، اسکے بعد مسٹر ہملٹن کی کوشش سے دفتر کمشنری آگرہ کے عہدہ نائب منشی پر اُن کا تقرر ہوا۔ یہاں انھوں نے اپنی قابلیت سے قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا خلاصہ طیار کیا اور بندوبست کے دفاتر کے متعلق ایک دستور العمل مرتب کیا۔ اسی عرصہ میں منصفی کے لئے امتحان کے قواعد شائع ہوئے سرسید نے امتحان دیا اور کامیاب ہوئے دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کی منصفی خالی ہوئی اور سرسید کا تقرر ہو گیا مگر جنوری ۱۸۴۲ء میں وہ وہاں سے فتحپور سیکری تبدیل ہو کر آ گئے۔

خطاب بادشاہی | اسی زمانہ میں وہ ایک مرتبہ دہلی آئے اور حکیم احسن اللہ خاں نے بہادر شاہ سے اُن کی تقریب اور سفارش کی

چنانچہ ان کو خطاب، جوادالدولہ، عارف جنگ عنایت ہوا۔

صدر امینی | دہلی سے وہ قائم مقام صدر امین ہوکر رہتک گئے اور اسکے بعد جنوری ۱۸۵۵ء میں مستقل صدر امین ہوکر بجنور آگئے۔

تعلیمی ترقی | زمانہ ملازمت کی مصروفیت اور فرائض منصبی کی کثرت نے سید کے ذوق علمی کو کبھی کم نہیں ہونے دیا اور باوجود اپنے بڑے بھائی سید محمد (منصف) کے حادثہ انتقال کے انھوں نے اس زمانہ میں علمی مشاغل کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ دہلی کے زمانہ منصفی میں انھوں نے گویا ازسر نو اپنی تعلیم شروع کردی اور مولوی نوازش علی سے اکثر کتابیں فقہ میں اور بعض دیگر کتب درسی جو کبھی پہلے دیکھی تھیں دوبارہ پڑھیں۔ مولوی فیض الحسن سے مقامات حریری اور سبعہ معلقہ اور مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ رفیع الدین صاحب کے صاحبزادہ تھے حدیث و قرآن کا درس لیا۔

علمی مشاغل | اسی زمانہ میں انھوں نے دو زبردست علمی کام کئے یعنی آثار الصنادید کی تصنیف اور آئین اکبری کی تصحیح۔ اسکے علاوہ متعدد مذہبی و علمی رسائل بھی تصنیف کئے جن میں سے دو علم ہندسہ اور حرکت زمین کے متعلق اور چند کلمۃ الحق، وراہ سنت و بدعت و نمیقہ عقائد و تصوف میں اور سلسلۃ الملوک فن تاریخ میں ہیں۔

آثار الصنادید | آثار الصنادید سید کی جلیل القدر علمی خدمات کی یادگار ہے دہلی تہذیب و تمدن اسلامی کا قدیم مرکز ہے اور سرسید نے جس زمانہ میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تو وہ بساط اُلٹ چکی تھی اور جو ٹوٹی پھوٹی نشانیاں باقی تھیں وہ بھی زمانہ کی رفتار مٹانیوالی تھی چنانچہ چند ہی سال بعد زمانہ غدر میں سارا شہر دہلی اک ویرانہ کی حیثیت میں آگیا اور بہت سی وہ عمارات اور آثار اور اکثر محلے اور حویلیاں جن کا آثار الصنادید میں تذکرہ ہے دنیا سے اس طرح مٹ گئیں کہ اب بجز اوراق کتاب کے اُن کی کوئی یادگار باقی نہیں۔ شہر دہلی اور اس کے مضافات میں بے شمار عمارتیں، کھنڈر، باؤلیاں، مدرسے، خانقاہیں وغیرہ تاریخی حیثیت رکھتی ہیں اُن کا مفصل حال صحیح نقشہ، اُن کی تبدیل شدہ حالت کے وجوہ اور اُن کے کتبوں کی نقلیں حاصل کرنا غیر معمولی استقلال و ہمت کا کام ہے سرسید نے اِن تمام حالات کو ڈیڑھ برس کی مسلسل محنت و جانفشانی کے بعد فراہم کیا اور کتاب مع چند مفید ابواب کے جن میں تاریخی حالات اور مشاہیر دہلی میں سے ایک سو بیس صاحبانِ کمال کے تذکرے میں ۱۸۴۷ء میں اول مرتبہ شائع ہوئی اور ۱۸۵۴ء میں اس کا دوسرا اڈیشن جدید ترتیب و نظر ثانی کے بعد طبع ہوا۔ ۱۸۶۱ء میں آثار الصنادید کا

فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اور اسی تصنیف کے صلہ میں وہ رائل ایشیاٹک سوسائیٹی کے ممبر مقرر ہوئے

تصحیح آئین اکبری | آئین اکبری کو جو اہمیت اس زمانہ میں حاصل ہے اس سے انکار ممکن نہیں سرسید کو جب اس کتاب کی صحت اور طباعت کا خیال ہوا تو اکثر نسخے قابل اعتبار نہ تھے انہوں نے جسقدر نسخے فراہم ہو سکے جمع کر لئے اور پھر تصحیح کا کام شروع کیا ایک زبردست مقدمہ اور نہایت کثرت سے حواشی کا اضافہ کیا۔ بیشمار نقشے اور تصاویر شامل کیں اور عہد مغلیہ کی اصطلاحات اور اُس زمانہ کے اوزان وسکہ جات کی مکمل تشریح کی۔

افسوس ہے کہ ایام غدر میں اس کتاب کا بڑا حصہ تلف ہو گیا لیکن جلد اول وسوم اب بھی باقی ہیں اور اہل نظر جانتے ہیں کہ تصنیف و تالیف کا جو قدرتی ملکہ سرسید میں تھا اس کی یہ جلدیں کیسی زبردست شہادت ہیں۔

باب دوم

خدمات غدر

سرسید کی پبلک خدمات جن میں تمدنی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی

ہر قسم کی کوشش شامل ہیں اُن کی زندگی میں اس کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں کہ سب کا احاطہ کرنا بے انتہا دشوار ہے۔ اُن کی طبیعت کی بیچینی اور دل کا درد اون کو نچلا بیٹھنے نہ دیتا تھا اور اُن کی بلند نظری اور علو ہمت مصائب و افکار کے ساتھ تمسخر کرتی تھی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ گو ان کی زندگی ہزار ہا ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جن کا ذکر کسی دوسرے شخص کے لئے کمال فخر و ناز کا باعث ہو سکتا ہے لیکن سر سید کو دوسرے مہتم بالشان کارناموں کے مقابلہ پر اُن کا تذکرہ بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

ابتداءً جب اُن کو ملازمت کی فکر دامن گیر ہوئی تو اُن کے محسن مسٹر ہملٹن نے اُن کو دہلی میں اپنا سر رشتہ دار مقرر کرنا چاہا جس کو اس نوجوان نے محض اس بنیاد پر قبول نہیں کیا کہ وہ اپنی لیاقت اس عہدہ کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔ اس خود شناسی و دوربینی کا تقاضا تھا کہ جب کام مل گیا تو محض اداے فرض ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ ہر دفتر و محکمہ کے لئے باوجود ادنیٰ اہلکار ہونے کی اصلاحی تجاویز بھی پیش کرتے رہے جن میں سے اکثر منظور ہوئیں اور آج تک اُن پر عملدرآمد ہوتا ہے۔ اصلاح و ترقی کا یہ شوق فطری تھا۔ اسی لئے وہ جس جگہ ہوتے وہاں کے لوگوں اور کاموں کی اصلاح و ترقی کی فکر اُن کو لگی رہتی۔

۱۸۵۷ء | بجنور کی صدر امینی پر آئے ہوئے اِن کو دو برس ہی گذرے تھے کہ فضائے ہند میں وہ عظیم الشان ہیجان ہوا جس کو عرف عام میں غدر یا محض "۱۸۵۷ء" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ آزادیٔ وطن کے لئے ایک حرکت مذبوحی سے کم نہ تھی۔ عہد انقلاب کی خصوصیات اور زمانہ دار و گیر کے تکلیف دہ جزئیات کا یہ موقع نہیں لیکن ظاہر ہے کہ ایسے زمانہ میں بجا و بیجا، جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور خود غرضی، نفسانیت اور جذباتِ انتقام برانگیختہ ہوتے ہیں بالخصوص ۱۸۵۷ء میں ایک خاص حالت تھی اور علاوہ مذکورہ بالا کیفیت کے سیاسی و مذہبی شکایات اور حاکم و محکوم کی رنجش نے کچھ ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ غلط فہمیوں اور بے بنیاد افواہوں کا ایک سیلاب تھا جو کسی طرح فرو نہیں ہوتا تھا۔ نیز مختلف خیال کے لوگ انگریزی حکومت کے خلاف مختلف رائیں رکھتے تھے اور مخالفت پر ایسا گہرا مذہبی رنگ چڑھا ہوا تھا کہ کسی شخص کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ کھلے بندوں اور بغیر کسی وسوسہ کے حکومت کا ساتھ دے سکے، کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے لئے انگریزی حکومت "اولی الامر" کی حیثیت رکھتی تھی اور انگریزی قوم کی بیدار مغزی، ہوشمندی اور عہد و پیمان کی استواری و غیر جانبداری کا ایسا گہرا نقش ان کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا کہ وہ

اُس کے وجود کو ہندوستان کے لئے مفید سمجھتے تھے۔

اِن خیالات کو زیادہ تر اس وجہ سے تقویت ہو گئی کہ حکومت مغلیہ کا جو نمونہ دہلی کے لال قلعہ میں نظر آتا تھا۔ اور ہندوستانی عمّال سلطنت اور شرفا کی جو حالت اس وقت تھی اون کو دیکھتے ہوے کسی طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ اِن کا وجود حکمرانی کے بار کا متحمل ہو سکتا ہے سر سید بھی اس حقیقت کو سمجھ چکے تھے اور جانتے تھے کہ ہندوستانی اب اپنی کھوئی حکومت واپس نہیں لے سکتے۔

ابتدائی کام | چنانچہ غدر سے پہلے جو کچھ سر سید نے کیا وہ اپنی فطری تقاضائے ہمدردی کی بنا پر تھا۔ مثلاً قیام بجنور کے زمانہ میں آئین اکبری کی تصحیح واشاعت کے علاوہ کمیٹی رفاہ عام کی خدمات وہ انجام دیتے رہے اور ضلع بجنور میں جس کو غالباً ازل سے آج تک اچھی سڑکیں نصیب نہیں ہوئیں انہیں کی کوششوں سے بعض عمدہ سڑکیں بن گئیں لیکن ہنگامہ غدر کے بعد جو حجاب باقی تھا وہ بھی اُن کی سامنے سے اُٹھ گیا اور سر سید ہمہ تن رفاہ عام کے کاموں میں لگ گئے۔

خدمات غدر | سر سید نے زمانہ غدر میں اپنے ملک کی دو قسم کی خدمتیں کیں اول اپنے فرائض کی ادائگی میں ہمت وجوانمردی کا اظہار اور جتنے الوسع نقض امن کا انسداد، دوسرے غدر کے بعد حکومت

حکومت اور اہل وطن کی غلط فہمیوں کی رفع داد یہ دونوں کام اپنی اپنی جگہہ اس قدر دشوار اور مہتم بالشان تھے کہ ان کا صحیح اندازہ کرلینے کے لئے ہنگامہ غدر کی کیفیت ظاہر کرنا ضرور ہے۔ بجنور میں تھوڑے سے انگریز حاکم تھے اور غدر کی آگ اس نواح میں اس شدت سے بھڑک رہی تھی کہ ان لوگوں کو اپنی جانیں سلامت لیجانا قطعاً ناممکن تھا نواب محمود خاں اور ہلدور کی جاٹ دونوں طرف سے ضلع کو گھیرے ہوئے تھے دوسری جانب سے دہلی اور میرٹھ کی فوجیں پڑی ہوئی تھیں اس موقع پر محض سرسید کی ہمت ودلیری نے ان لوگوں کی جانیں بچائیں اور جب انگریز وہاں سے بھاگ کر رڑکی چلے گئے تو نواب کی فوجوں نے بجنور پر قبضہ کرلیا خود سرسید اور تحصیلدار بجنور بھی وہاں سے بھاگ گئے لیکن نواب نے اُن کو بلوایا اور حکم دیا کہ وہ بجنور رہیں۔ اس زمانہ میں اور باغیوں کی فوجوں کی واپسی کے بعد جب انگریزی حکومت نے دوبارہ ضلع کا انتظام شروع کیا سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں تنہا اس تمام علاقہ کے سیاہ وسفید کے مالک تھے، اس نقض امن کے بعد نظم ونسق قائم کرنے کے لئے نہایت دشوار گذار مراحل درپیش تھے۔ ایسے نازک موقع پر اپنے اصول کو ہاتھ سے نہ دینا اور اپنے ہموطنوں کی حفاظت سے غافل نہ ہونا۔ بجائے خود اک کارنامہ ہے اور ان خدمات کی قدر ایسی

حالت میں اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی زمانہ میں دوسرے لوگوں نے جن کو اس قدر منصب اختیار بھی نہ تھا ذاتی اغراض کے لئے کیا کچھ نہیں کیا

صلہ میں جاگیر سے انکار | سرسید کی اِن خدمات کی حقیقت اس ایک واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ کہ جب ہنگامۂ غدر کے بعد ایک عہد غدر" اور رونما ہوا اور باغیوں کے لئے دار و رسن اور وفاداروں کیلئے صلہ ہائے خدمات تجویز ہونے لگے تو سرسید کے لئے بھی اک بڑی جاگیر وفاداری و خدمات غدر کے صلہ میں تجویز ہوئی۔ میر صادق علی و میر رستم علی رئیسان چاندپور ضلع بجنور بہت بڑے تعلقہ دار تھے جو اک خفیف الزام کی بنا پر مجرم قرار پاے اور اُن کی جایداد ضبط ہو گئی یہ ہی وہ جاگیر تھی جو سرسید کو دیجانی تجویز ہوئی تھی مگر اس شخص کی غیرت و حمیت نے گوارا نہ کیا کہ اک مسلمان کے خون سے اپنی پیاس بجھائے چنانچہ انھوں نے اس جاگیر کے لینے سے قطعی انکار کر دیا۔

مرادآباد کی تبدیلی | اپریل ۱۸۵۸ء میں وہ بجنور سے مرادآباد تبدیل ہو کر آے اور عہدہ صدر الصدوری پر ممتاز ہوے۔ سال آئندہ کمیشن جائداد منضبطہ ہنگامۂ غدر کے ممبر مقرر کئے گئے۔ سرسید تنہا

ہندوستانی ممبر تھے۔ اور جس تحقیقات میں کمیشن مصروف تھا اسکی اہمیت و نزاکت کے اعتبار سے اِن کا شریک کیا جانا ہی اک نئی اور خاص بات تھی۔ چنانچہ سرسید کی شرکت کی وجہ سے کمیشن تحقیقات میں احتیاط برتنے پر مجبور ہوا، کہا جاتا ہے کہ اس ضلع میں جس قدر جائدادیں ضبطی سے محفوظ رہیں وہ زیادہ تر سرسید کی جرأت و صداقت کی رہین منت ہیں۔

تاریخ سرکشی بجنور | سرسید نے مراد آباد ہی میں تاریخ سرکشی بجنور شائع کی، جس کے متعلق تمام سامان اور ضروری یادداشتیں وہ ہنگامہ غدر ہی میں جمع کرتے جاتے تھے اور ان کو بہ احتیاط اپنے پاس محفوظ کر لیتے تھے۔ ضلع بجنور کے متعلق صحیح واقعات کا علم اور اس کے اسباب و علل پر نگاہ بھی۔ سرسید ہی کو تھی اسی لئے اس کتاب کو اس ہنگامہ قیامت خیز کی صحیح یادگار تصور کیا جاتا ہے۔

رسالہ اسباب بغاوت ہند | انقلاب ہی ایسی چیز ہے کہ پوشیدہ حالات کو آشکارا اور مخفی حقیقتوں کو بر روے کار لے آتا ہے۔ تذبذب و غلط فہمی باقی نہیں رہتی اور ہر اصول اک خاص متعین شکل میں نظر آنے لگتا ہے۔ ہنگامہ غدر قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا۔ اور اگرچہ اس کا نتیجہ انقلاب حکومت نہ ہو سکا لیکن بادشاہ دلی اور نوابوں کی

عملداری کی حقیقت بھی کھل گئی۔ غالباً یہ ہی چیز تھی جس نے سرسید کو انگریزی حکومت کے استحکام اور اپنے ہم وطنوں کی درماندگی اور تباہی و بربادی کے متعلق مستقل رائے قائم کرنے پر مجبور کیا۔ جب غدر ختم ہوا اور انگریزی حکومت نے دوبارہ اپنا دور دورہ قائم کیا تو جذبات انتقام برانگیختہ تھے، مارشل لا ہر جگہ جاری تھا، اور ذرا سے شبہہ یا غلط بیانی پر انسان کی جان و مال دونوں ختم ہو جاتی تھیں۔ اس زمانہ دار و گیر میں جو کسی طرح ہنگامہ غدر سے کم نہ تھا سرسید نے اہل وطن کی ایک ایسی جلیل القدر خدمت کی ہے جو خود اُن کی زندگی میں ہی ایک یادگار واقعہ ہے حالانکہ اُن کی زندگی خدمات جلیلہ اور امور مہمہ سے بھری پڑی ہے۔

سرسید کو اچھی طرح یقین ہو گیا تھا کہ گو اس وقت آتش انتقام برافروختہ ہے اور انگریزوں کو ہر ہندوستانی باغی، اور ہر مشتبہ فعل جرم بغاوت نظر آتا ہے لیکن حقیقت حال اور اصلی سبب تک اُن کی ہی رسائی نہیں۔ اور جو لوگ غور و فکر کے اہل ہیں وہ بھی اس وقت اپنے جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئے ہیں کہ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا اُن کے لئے ناممکن ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں غدر اور

فساد کی ذمہ داری حکومت کی بعض خرابیوں اور مذہبی تعصبات اور دخل اندازی پر رکھی ہے اور اس تمام شورش و سرکشی میں جو اہل ہند کی طرف سے ہوئی کسی سازش کا نہونا قطعی اور مسکت دلائل سے ثابت کیا ہے یہ رسالہ ایسے وقت میں کہ موت کی گرم بازاری تھی اور زبان و قلم سوائے حکم تعزیر کے ہر کام سے عاجز تھے پیغام اجل سے کم نہ تھا۔ خود سرسید بھی خطرات سے پوری طرح واقف تھے اُن کے احباب نے بمنت و باچشم نم اُن کو سمجھایا اور منع کیا کہ اس حرکت سے باز آؤ۔ لیکن سرسید جانتے تھے کہ جس قسم کی غلط فہمیاں اس وقت پھیل رہی ہیں اور گرد کدورت کا جو غبار رفتہ رفتہ فضائے ہند پر مسلط ہوتا جاتا ہے اس کا انسداد اگر جرأت و ہمت سے اس وقت نہ کیا گیا تو آیندہ ہندوستانیوں کے لیئے اس زمین پر سانس لینا بھی آسان نہ ہوگا۔

سرسید نے رسالہ مذکور کی پانسو جلدیں طبع کرائیں اور صرف پارلیمنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا ہی میں بھیجیں تاکہ عام طور پر شاعت نہو

لائل محمڈنز آف انڈیا لیکن چونکہ غلط فہمیوں کا بازار گرم تھا۔ اور ہر انگریز اپنے دست و بازو کو قیام حکومت انگریزی کا ضامن سمجھتا تھا اسلئے ضرورت تھی کہ عام طور سے جن غدار اور سرکش خاندانوں کی داستانیں

مشہور ہو رہی ہیں انہیں کے ساتھ ان بیشمار مسلمانوں کا نام بھی ظاہر ہو جاے جنہوں نے اپنی جان اور عزت کو خطرہ میں ڈال کر ایسے نازک وقت میں انگریزوں کا ساتھ دیا مسئلہ جہاد نے بھی بعض فتووں اور پیشین گوئیوں کی وجہ سے عجیب صورت اختیار کر لی تھی اور اس کا ذمہ دار بھی مسلمانوں ہی کو سمجھا جاتا تھا غرض مسلمانوں کی نسبت اس قدر بدگمانیاں تھیں کہ ان کو بے بنیاد ثابت کرنا بڑا دشوار کام تھا سر سید نے رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا شائع کر کے یہ چاہا تھا کہ اس میں ان مسلمانوں کا ذکر تفصیل سے کیا جاے جنہوں نے انگریزوں کو ایسے نازک وقت میں بیحد مدد دی اور اس سے ان بے بنیاد الزاموں کو رفع کیا جاے جو بعض شخصی واقعات کے بنا پر ساری قوم پر لگائی جا رہی ہیں۔

نصاری | مسئلہ جہاد کی طرح لفظ نصاری بھی اس زمانہ میں ایک خاص معنے رکھتا تھا اور مسلمانوں کی تحریرات زمانہ غدر میں اس لفظ کے استعمال نے اوس کو انگریزوں کی نگاہ میں اک خاص معنے دیدیے تھے سر سید نے اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے بھی اک رسالہ لفظ نصاری کی تحقیق میں لکھکر شائع کیا۔

تبیین الکلام | اسی زمانہ میں اونکو خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جو اختلافات بڑھتے جاتے ہیں اور جن کو عیسائی

پادریوں کی دریدہ دہنی اور نامناسب حرکات نے اور اشتعال دیا ہو اُن کی اصلاح اس صورت سے ممکن ہے کہ مذہب عیسوی اور مذہب اسلام کی صحیح تعلیمات کا عام طور پر علم ہو اور ان میں جس قدر تطبیق ہے اس کو دکھایا جائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جاتا ہے اسکے وجوہ ظاہر کئے جائیں اس کام کے لئے بڑا سامان درکار تھا اور زرکثیر کی ضرورت تھی نیز بڑا وقت چاہئے تھا کہ اس کا سرانجام ہو۔ لیکن سرسید اپنی دھن کے آگے دقتوں اور دشواریوں کو خیال میں لانے والے نہ تھے انھوں نے زرکثیر اپنی جیب سے خرچ کیا اور مستقل کتب خانہ اور اک مطبع فراہم کیا ایک یہودی کو عبرانی زبان سیکھنے کے لئے ملازم رکھا اور تبیین الکلام کے نام سے انجیل کی مفصل تفسیر غازی پور میں لکھنا شروع کی۔

مقصد تصنیف تبیین الکلام کی تصنیف باعتبار دقت و دشواری کے اک بڑا کارنامہ ہے اور سرسید کی قوت ارادی اور خلوص نیت کی زبردست شہادت، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس تصنیف کا حقیقی فائدہ کیا تھا۔ مولانا حالی کے نزدیک اس تصنیف کا مقصد یہ تھا کہ "اسلام کی نسبت جو بدگمانیاں عیسائیوں کو ہیں وہ رفع کیجائیں اور مسلمان جو موجودہ بائبل کو مطلقاً استناد کے قابل نہیں سمجھتے اور اس میں تحریف لفظی کے قائل ہیں اس غلطی کو دور کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ انجیل و قرآن کی مذہبی حیثیت اور تاریخی حالت باوجود اتحاد مقاصد شدید اختلاف کی باعث رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی ناسخ و منسوخ کی یہی بحث ناگزیر ہے اور دنیا کی کوئی تاویل اس کھلی حقیقت کو بدل نہیں سکتی کہ انجیل مقدس اپنا دور ختم کر چکی اور قرآن کریم لازوال اور ابدی ہے۔ خالص علمی حیثیت سے جو مطابقت ان دونوں صحف سماوی میں پائی جاتی ہے وہ محض علما ہی کے سمجھنے اور غور کرنے کے لائق ہے۔ عام مسلمانوں یا عیسائیوں کے لئے نہ وہ دلکش ہے اور نہ قابل قبول۔ اس لئے کہ علمی حیثیت سے وہ قرآن اور انجیل کا مطالعہ کرنے کے عادی نہیں اور مذہبی حیثیت سے ان کے نزدیک ایمان و عقیدہ میں شرکت غیر کی گنجائش نہیں بعض بزرگوں کو کہتے سنا ہے کہ تبیین الکلام سے سرسید کا مقصد فی الحقیقت رد مذہب عیسوی تھا اور وہ اس تفسیر سے مذہب عیسوی کے منسوخ ہونے کا ثبوت فراہم کر رہے تھے۔ لیکن جن حالات کے ماتحت اس کام کو شروع کیا گیا اور جو اسلوب بیان اس تفسیر میں اختیار کیا گیا ہے اس سے یہ تسلیم کر لینا ہی دشوار ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سرسید نے ہنگامہ غدر کے بعد مسلمانوں اور حکومت انگریزی کے درمیان بہتر تعلقات پیدا کرنے کی اور بہت سی کوششیں کیں انہیں میں سے

ایک یہ بھی تھے۔ لیکن چند در چند دشواریوں کے سبب سے یہ کام پورا نہ ہوا اور تبیین الکلام کا سلسلہ نامکمل رہ گیا۔

انتظام قحط

غدر کے بعد ہی شمالی ہندوستان میں سخت قحط پڑا سر سید اس وقت مراد آباد میں تھے۔ انتظامات قحط اُن کے سپرد ہوئے سر سید نے ایک محتاج خانہ کھولا، اس میں بیماروں اور ضعیفوں کے لئے کھانے اور رہنے کا علیحدہ انتظام کیا۔ تندرست لوگوں کے لئے مزدوری کا سامان فراہم کیا۔ غریب اور پردہ نشین عورتوں کے لئے سوت کاتنے کا خاص اہتمام کیا۔ اسی طرح جو شریف لوگ دن میں محتاج خانہ کی امداد سے شرماتے تھے اُن کے لئے رات کا وقت مقرر کر دیا اور اس تمام کام کو اس خوبی اور مستعدی سے انجام دیا کہ اہل مراد آباد آج تک یاد کرتے ہیں سر سید اپنے ہاتھوں سے بیماروں کو ضعیفوں اور بھوکوں کو اُٹھاتے، اِن کے آرام اور کھانے کا انتظام کرتے اور ہر کام کی بذات خود نگرانی کرتے تھے۔

تصحیح تاریخ فیروز شاہی

زمانہ قیام مراد آباد ہی میں سر سید نے تاریخ فیروز شاہی ضیا برنی کی تصحیح کا کام رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی فرمائش سے کیا۔ جس کو سوسائٹی مذکور نے اپنے اہتمام سے طبع کرایا۔

غازی پور کی تبدیلی

مئی ۱۸۶۲ء میں سر سید کی تبدیلی ضلع غازی پور کو

ہوگئی مراد آباد میں انہوں نے یتیم خانہ کے انتظام اور ایک مدرسہ کے قیام سے جو تجربہ حاصل کیا تھا، نیز غدر کے بعد جو حقیقت حال اُن پر منکشف ہوگئی تھی اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ اب وہ ہمہ تن اس فکر میں لگے ہوے تھے کہ کس طرح ہندوستانیوں کو اِن کی موجودہ حیثیت میں سکون وراحت اور عزت ومنزلت نصیب ہوسکتی ہے ؛ وہ اول اول یتیم خانہ کے قیام اور امدادی کاموں کے اجرا کے خیال میں تھے لیکن بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب تک ملک میں تعلیم عام نہ ہوگی اور اپنے حکمرانوں کی طرز حکومت سے واقفیت حاصل نہ ہوگی کسی فلاح و بہبود کی توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ علوم مغربی اور زبان انگریزی سے واقفیت اس کام کے لئے ناگزیر ہے،

مدرسہ غازی پور | چنانچہ غازی پور میں ایک مدرسہ انگریزی انہوں نے قائم کیا۔ اور وہاں کے روسا، وعمائدین کو اس کی امداد پر متوجہ کیا

سائنٹفک سوسائٹی | وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ تعلیم انگریزی کا عام رواج اس وقت تک ممکن نہیں کہ اہل وطن علوم انگریزی سے واقفیت حاصل نہ کریں۔ اور اس مقصد کی کامیابی اس وقت تک نہیں ہوسکتی کہ انگریزی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرکے عام طور پر نہ شائع کیا جاے۔

یہ مسئلہ کہ تراجم کے ذریعہ سے علوم مغربی کو اردو میں منتقل کیا جانا کہاں تک مفید ہے اب نزاعی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ ملک کی مختلف جماعتوں کی مفید و مشکور کوششوں نے اس کی حقیقت پوری طرح منکشف کر دی ہے۔ سر سید کا سب سے پہلے اس طرف متوجہ ہونا اُن کی اصابت رائے اور دوربینی کی زبردست دلیل ہے اور اسی وقت سے اُن کی زندگی بالکل قومی کاموں کے لئے وقف ہو گئی۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء میں جو التماس انہوں نے "بخدمت ساکنان ہندوستان درباب ترقی تعلیم اہل ہند" شایع کیا اس کو اُن کی زندگی اور مساعی کا اک نیا باب سمجھنا چاہیئے۔ اسی التماس میں انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی قیام کی تجویز پیش کی اور کمال سرگرمی سے اس کو عملی جامہ پہنایا۔

اس سوسائٹی کا مقصد مفید انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرنا تھا، صوبہ شمال ہند و پنجاب کے لفٹنٹ گورنر اسکے سرپرست اور ڈیوک آف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے اسکے مربی قرار پائے، اور ترجمہ و اشاعت کا کام غازی پور میں جاری ہو گیا۔

علی گڈھ میں سوسائٹی کا قیام

۱۸۶۴ء میں سر سید غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڈھ آئے اور اپنے ساتھ سائنٹفک سوسائٹی کو بھی

علی گڈھ لے آئے، اور یہاں سوسائٹی نے غیر معمولی ترقی کی۔ ایک مستقل عمارت نہایت شاندار تیار ہو گئی، بڑا مطبع قایم ہو گیا، آمدنی میں بہت اضافہ ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں متعدد کتابیں مختلف علوم وفنون کی ترجمہ ہو کر اردو میں شائع ہو گئیں۔

سرسید کا ایثار | سوسائٹی کے کاروبار کی یہ حیرت انگیز ترقی اور کامیابی زیادہ تر سرسید کی ذاتی کوششوں اور ان کے بے نظیر ایثار وسرگرمی کی رہین منت ہے۔ انھوں نے سوسائٹی کی کامیابی کے لئے جو ذرائع اختیار کئے اِن کے علاوہ بہت کچھ اپنی ذات سے دیا۔ غازی پور میں انھوں نے آٹھ ہزار روپیہ کے سرمایہ سے ایک پریس قایم کیا تھا جس کو وہ تبیین الکلام کے خیال سے چلانا چاہتے تھے علی گڈھ پہنچ کر جب سوسائٹی کی عمارت تیار ہو گئی تو یہ پریس انھوں نے سوسائٹی کی نذر کر دیا۔

ایک اور ذریعہ آمدنی انھوں نے یہ سوچا کہ مختاری اور وکالت کے امتحانات کے لئے جو امیدوار جانا چاہتے تھے اُن کی تعلیم کے لئے ایک کلاس قائم کیا اور خود اس میں قانون پر لکچر دیتے تھے۔ اس کلاس کی جو آمدنی بذریعہ فیس ماہانہ ہوتی تھی وہ سب سوسائٹی کی نذر کر دیتے تھے۔

نواب سکندر بیگم صاحبہ مرحومہ رئیسہ بھوپال نے سرسید کی پبلک خدمات کا حال سنا تو ازراہ قدردانی ایک انگوٹھی الماس کی انکو ہدیتہً بھیجی۔ سرسید نے فوراً اس کو بھی سوسائٹی کے نذر کر دیا۔

علی گڈھ سے بنارس | سرسید کی کوششوں نے سائنٹفک سوسائٹی کو اس قدر وسعت دیدی تھی کہ اس کے کاروبار کو سنبھال لینا آسان کام نہ تھا، ایک اخبار سوسائٹی کا نکلتا تھا جس کو زیادہ تر سرسید ہی مرتب کرتے تھے۔ سوسائٹی کی ترقی کے ساتھ ان کو اردو یونیورسٹی کا خیال پیدا ہوا تھا اور اسکے علاوہ تعلیم کو عام کرنیکے خیال سے انہوں نے ایک کمیٹی اور بھی قائم کی تھی۔ نیز اخبار اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے ذریعہ سے انہوں نے سیاسیات میں بھی کام شروع کردیا تھا اسی لئے جب ان کا تبادلہ علی گڈہ سے بنارس کو ہوا تو وہ بنارس پہنچ کر کوئی نیا کام نہ کرسکے بلکہ علی گڈہ کے کاموں اور سوسائٹی کی ضروریات ہی کی فکر میں رہے۔ البتہ زمانہ قیام بنارس میں اردو ہندی کا جھگڑا پیدا ہوا اور اس نے سرسید کی راے پر غیر معمولی اثر کیا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے رسالہ طعام اہل کتاب بھی شایع کیا اور بنارس سے ہی رخصت لے کر سفر انگلستان اختیار کیا جو بالآخر ان کی اصلاحی کوششوں کیلئے ایک زبردست ذریعہ بن گیا

باب سوم

سفرِ انگلستان

اس وقت تک سر سید باوجود پابندی ملازمت جس قدر کام رفاہِ عام اور اہل وطن کی فلاح کے لئے کرتے رہے انہوں نے اِن کو ایک خاص نتیجہ تک پہنچا دیا اور اپنی مختلف کوششوں کا صلہ اُن کو یہ ہی ملا کہ وہ تشخیص مرض میں کامیاب ہو گئے وہ جانتے تھے کہ سیاسی پیچیدگیاں اور انگریزوں کا جدید عہد حکومت یا غدر کے بعد عام مصیبت و فلاکت کا علاج بھی جب ہی ممکن ہے کہ اول ملک اور قوم سے جہالت و تعصب، تنگ نظری اور پست ہمتی کو دور کیا جائے اس مقصد کے لئے مفید و اعلیٰ تعلیم کی وسعت و ترقی ضروری تھی۔ چنانچہ اس وقت سے اُن کی تمام کوششیں خواہ وہ سیاسیات میں ہوں یا مذہب و معاشرت کی اصلاح میں سب اسی مقصد کی تکمیل کی غرض سے ہوتی تھیں۔

ترقی تعلیم کا خیال سر سید نے طریقہ تعلیم اور مشرقی علوم اور اپنے

سرمایۂ علمی پر بھی غور کیا تھا، خود ہمیشہ علمار اور اہل فن کی صحبت اُٹھائی تھی، پہلے لوگوں کے حالات دیکھے تھے موجودہ طریقہ تعلیم سے واقف تھے اس لئے وہ ہندوستان کے مروجہ مدارس اور اُن کے طریقہ تعلیم کی نسبت رائے قایم کر سکتے تھے۔ لیکن انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کی نسبت اُن کو رائے قایم کرنے میں بیشمار دشواریاں درپیش تھیں۔

اگر اُن کے نزدیک دو چار مدرسے قایم کر دینا کافی ہوتے تو اس کے لئے شاید اُن کو زیادہ کدو کاوش کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن وہ اپنی قوم کے تمام امراض کا علاج اس ایک نسخہ سے کرنا چاہتے تھے اس لئے ضرورت تھی کہ جس تعلیم کو وہ جاری کرنا چاہتے تھے اس کی کماحقہ واقفیت حاصل کریں اور پھر اپنے حالات اور ضروریات پر نظر کر کے جس قدر اور جس طریقہ سے مناسب ہو اس کا انتظام کریں۔

سفر یورپ

اس مقصد کے لئے اِن کو خیال ہوا کہ یورپ کا سفر اختیار کرنا چاہیئے۔ حسن اتفاق سے اس وقت سید محمود بغرض تعلیم لندن جا رہے تھے۔ سر سید کو یہ بھی ایک بہانہ ہاتھ آیا اور اُن کی رفاقت کے موقع کو غنیمت سمجھا۔

مقصد سفر

اگرچہ سر سید ہندوستان ترقی تعلیم کی نسبت

راے قایم کر چکے تھے لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کی حالت اس قدر تباہ ہے۔ اور اس کی فلاح وبہبود کی راہ میں اس قدر موانعات ہیں کہ ان کی کوششیں جب ہی کامیاب ہو سکتی ہیں کہ وہ ہر طرف ہاتھ پانوں ماریں اور اصلاح وسعی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں۔ اسی بنا پر اُن کو سفر یورپ میں بہت سے مفید کام نظر آتے تھے جن کا صحیح اندازہ خود بھی گھر بیٹھے نہیں کر سکتے تھے۔ خدمت مذہبی کا ولولہ بھی (جس کا ذکر آگے آئے گا) اس سفر کا محرک تھا اور سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب لکھنے کی جو بیقراری انکو لگی ہوئی تھی اس کا اہتمام بھی لندن ہی میں بیٹھ کر ممکن تھا۔

لیکن ان تمام وجوہ سے زیادہ قرین قیاس سر سید کا وہ احساس فرض اور اصول کار تھا جس نے نوجوان سید احمد کو اس ملازمت کے قبول کرنے سے باز رکھا جس کی لیاقت وہ اپنے میں نہ پاتا تھا۔ یا فرض شناسی اور کمال سعی کی وہ ہمت ہے جس نے اس کو "اسباب بغاوت" لکھنے پر مجبور کیا وہ جانتے تھے کہ مغربی تعلیم جاری کرتے ہو تو مغربی تعلیم گاہوں کو دیکھ لو، اجتہاد فی المذہب کی بنیاد ڈالتے ہو تو تقلید کی بندشوں سے آزاد ہو جاؤ حکومت وسیاسیات ملک میں اپنا دخل چاہتے ہو تو سول سروس میں

شریک ہو افلاس و تنگدستی کا رونا روتے رہو تو تجارت و صنعت کی سبق سیکھو، جہالت اور تعصب نے گھیر لیا ہے تو روشنی اور آزادی ڈھونڈھو، خواہ وہ کہیں ملے "ولو کان بالصین"

درخواست رخصت | چنانچہ حصول رخصت کے لئے جو درخواست اُنھوں نے دی تھی اس کے بعض فقرے یہ ہیں۔

.. یہ بات بخوبی میرے ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی فلاح و بہبودی کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو جس کی ملازمت کا فخر مجھکو حاصل ہے بخوبی استحکام اور پائداری بخشنے کے واسطے اسکے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اہل یورپ اور ہندوستان کی درمیان ربط و ضبط کو ترقی دی جاے۔ پس اس مقصد کے تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری راے میں یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہئے۔ تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شایستگی کے عجیب و غریب نتیجوں اور اس کی ترقی کو بچشم خود مشاہدہ کریں اور اس بات کا اندازہ کرسکیں کہ انگلستان کے لوگ کیسے دولت مند، طاقتور اور دانا ہیں۔ اور ان مفید اور عمدہ باتوں کو ہندوستان کی

بھلائی کے واسطے سیکھیں جو اس امر کے نتیجے ہیں کہ تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں، اور کارخانوں اور کاشتکاری اور شفاخانوں اور خیرات اور اُسکے شہروں کی صفائی اور اس کی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ کام لیا جاتا ہے "

موانع سفر

سرسید کے لئے یہ سفر ایسا آسان نہ تھا جیسا کہ عام لوگوں کا خیال تھا۔ بلکہ جس قدر موانع اور دشواریاں اُن کی راہ میں درپیش تھیں اُن کا تصور کرتے ہوے یہ قیاس میں بھی نہیں آتا کہ انھوں نے اتنے بڑے کام کی ہمت کس طرح کی علاوہ اس کے کہ یورپ کا سفر اس زمانہ میں عام نہ تھا بلکہ خاص خاص لوگ بھی پوری طرح واقف نہ تھے کہ اس راہ کے نشیب و فراز کیا ہیں، ملک میں توہمات اور تعصبات کا وہ طوفان تھا جو سمندر کی موجوں سے بھی زیادہ طغیانی پر تھا اور سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ سرسید کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ وہ اس بارگراں کے متحمل ہو سکتے لیکن عزم راسخ کی جو مثالیں اُن کی زندگی میں ملتی ہیں اُن کو دیکھتے ہوے ہمیں حیرت بھی ہوئی کہ انھوں نے اپنا گھر بار سب ختم کر دیا مکان اور کوٹھی رہن رکھی اور کتب خانہ فروخت کر دیا اور بالآخر

اپنے ارادہ میں کامیاب اور موانعات پر غالب آئے۔

کام کی دھن | سر سید کا سفر جس طرح ایک بڑے مقصد کیلئے تھا اسی قدر اون کا جوش اور کام کرنے کا ولولہ بڑھا ہوا تھا اثنا ے راہ میں ہی انہوں نے ہر نئی چیز اور نئے کام کی دیکھ بھال اور مختلف الخیال لوگوں سے ہندوستانیوں کے سود و بہبود کی مسئلہ پر گفتگو شروع کردیتی تھی اپنے حالات سفر پابندی کیساتھ اہل وطن کے مطالعہ و استفادہ کے لئے لکھتے جاتے اور لندن پہنچتے پہنچتے وہ اپنے بعض کاموں کی فکر میں لگ گئے۔ تعلیمی مسائل اور تمدنی و سیاسی معاملات پر غور کرنے کا وقت تو بعد کو آتا لیکن جس درد کو لے کر وہ اٹھے تھے اُس کی بیچلینی برابر ترقی کرتی جاتی تھی اور لندن پہنچتے ہی جو خط انہوں نے نواب محسن الملک کو لکھا ہے اس میں فقرات ذیل موجود ہیں۔

"مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ بعض احباب نالائق مثل مولوی ز۔ ع نے میرا ارادہ دربارہ تحریر جواب کتاب میور صاحب جو نسبت آنحضرت صلعم لکھی ہے سست کردیا اور بروقت روانگی سامان اور چندہ کرنے نہیں دیا۔ یہاں اسکے جواب کا اس قدر سامان ہے کہ بیان نہیں ہوسکتا

کتب خانہ انڈیا آفس میں نے دیکھا ہوش جاتے رہے۔ کتب خانہ نہیں ہے۔ کتابوں کا شہر ہے مجھے وہاں جانے کی اور پڑھنے کی جو چاہوں اور نقل کی سب اجازت ہوگئی۔

ابھی کتب خانہ برٹش میوزیم نہیں دیکھا سنا ہے کہ وہ اس سے بھی بہت بڑا ہے بہرحال میں کچھ نہ کچھ نسبت جواب کتاب ولیم میور صاحب کے ضرور کروں گا،،

دو ڈہائی مہینے نہین گذرے تھے کہ یہ خواہش اب قصد و ارادہ کی حد تک پہنچ گئی اور وہ دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ ؛

اِن دنوں میں ذرا میرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرتؐ کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں اُس نے دل کو جلا دیا۔ اور اِن کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا۔ اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیرہ میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھدی جاے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جاے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤنگا کہ اُس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمدؐ صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔ مارا ہمیں تمغہ شاہنشاہی بس است

مین نے فرانس اور جرمن سے اور مصر سے کتب سیر منگا نی۔ شروع کردیں، چھپیات روانہ ہوگئیں سیرت ہشامی مطبوعہ اور چند کتابیں لیڈن کی خریدلیں۔ ایک آدمی مقرر کرلیا جو لیڈن کا ترجمہ کرکر مضمون بتلا سکے۔ تین مقدمات لکھنے شروع کردیے۔ اول جغرافیہ عرب، دویم انساب عرب سویم ثبوت آنحضرتؐ کی نسل کا حضرت ابراہیم تک سب سے مشکل کام جغرافیہ ہے اور تمام چیزوں کی متعلق اسلام و سیر کے ثبوت کی بنیاد ہے۔ خیر اب دعا کرو خدا مدد کرے اور انجام کو پہنچا دے

ہرچہ بادا باد کشتی در آب انداختیم

خطبات احمدیہ | سرسید نے بالآخر اپنی ہمت کے بھروسہ پر اس عظیم الشان کام کا بیڑا اُٹھایا اور اگرچہ مالی دشواریوں اور ترتیب و تہذیب اور فراہمی کتب و تحریر و تنقید کی دقتیں اس کام میں بے اندازہ تھیں لیکن ان سب کو کمال صبر و استقلال سے برداشت کرتے رہے اور کئی ماہ کی مسلسل کوششوں اور تکالیف کے بعد سر ولیم میور کی کتاب کا رد شائع ہوگیا جو بعد میں اردو زبان میں زیادہ مکمل و قابل قدر صورت میں 'خطبات احمدیہ' کے نام سے موسوم ہوا۔

مالی مشکلات

سر سید کو خطبات احمدیہ" کے طبع و اشاعت میں جن مالی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا اس کا اندازہ اُنہیں کی تحریروں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ بھی نظر آتا ہے کہ اُن کی اس خدمت اور ایثار و قربانی کی داد اہل وطن نے کیا دی تو اس کام کی عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے وہ اپنے ایک خط میں نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں

مین اپنا حال کیا لکھوں سکتہ کا سا حال ہو گیا ہے۔ دن رات کی محنت و مشقت اور اوس پر طرح طرح کی تکلیف سے جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے، جلد اول خطبات الاحمدیہ کی تصنیف تمام ہوئی اور اس مہینہ میں چھاپہ بھی تمام ہو جاوے گا اب جو اندازہ اُس کی یعنی ایک جلد کے چھاپہ کی لاگت کا کیا گیا تو ڈہائی ہزار روپیے سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے۔ ہوش جاتے رہے اور جان مین جان نہیں ہے۔

اس سے قبل وہ ایک خط میں احباب مخلصین سے چندہ کرنے اور کچھ رقم اپنے لئے قرض لینے کی درخواست کر چکے تھے اسی سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں کہ۔

ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے اور مینے لکھا ہے

کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف
مسی تک فروخت کر کر ہزار روپیہ بھیج دو۔"

انیتھم کلب کی ممبری | سر سید کے علمی مشاغل اور سلسلہ تصنیف و تالیف نے لندن کے علمی حلقوں سے اِن کا بخوبی تعارف کرا دیا اور بعض مستشرقین اِن کو پہلے سے ہی جانتے تھے مصنف آثار الصنادید اور مدیر تاریخ فیروز شاہی کا نام ایسا نہ تھا جو اہل علم حضرات سے پوشیدہ رہتا۔ وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے فیلو مقرر ہو چکے تھے، زمانہ قیام لندن میں اِن کو دوسرا علمی اعزاز انیتھم کلب کی ممبری ملی جو بلاشبہ اہل علم کے لئے سرمایہ افتخار ہے۔

سرکاری اعزازات | سر سید کو مشاغل علمی کے علاوہ حکومت انگلستان اور عمائدین لندن سے بھی تعلقات پیدا کرنے کا خیال تھا۔ اس کام میں لارڈ لارنس سابق گورنر جنرل نے اُن کی بیحد اعانت کی ہمیشہ عزت و بے تکلفی سے ملتے رہے، اُن کو تمام معززین اور عمائدین سے روشناس کرایا، انڈیا آفس میں اُن کی تقریب کی اور خطاب و تمغہ سی، ایس آئی کا محرک ہوئے۔ اسی سلسلہ میں اُن کو ملکہ وکٹوریہ کی لیوی اور پرنس آف ویلز کی لیوی میں باریابی حاصل ہوئی۔

لندن میں سر سید کی وقعت | سر سید لندن کے عمائدین اور اہل علم سے

محض رسماً نہیں ملتے تھے بلکہ وہ لوگ واقعی اِن کی قدر و منزلت کرتے تھے جس کا ثبوت اُن کی تحریروں سے ملتا ہے اور جس علمی مجلس یا دعوت و جلسہ میں وہ شریک ہوئے اونہوں نے ہمیشہ اپنے طرزِ عمل اور اظہار خیالات سے اپنی وقعت قایم کی۔ سول انجینیرس ایسوسی ایشن کے اک جلسہ میں اِن کو شرکت کی دعوت دی گئی وہاں پہنچے تو بعض حاضرین جلسہ نے اپنی تقریروں میں اِن کی شرکت پر اظہار مسرت اور اِن کی لیاقت و قابلیت کا اعتراف کیا اس موقع پر سرسید کو بھی اپنی طرف سے شکریہ میں کچھ کہنا ضرور ہوا۔ چنانچہ انہوں نے جو تقریر اس وقت کی اور ترجمہ کر کے وہ انگریزوں تک پہنچائی اس کی بیحد تعریف ہوئی

مسئلہ تعلیم پر غور و فکر | سرسید اپنے مقصد سفر سے غافل نہ تھے اور لندن پہنچ کر باوجود گوناگوں مصروفیتوں اور مشاغل علمی کے اُن کو اپنے کام کی برابر فکر تھی۔ اہل یورپ کی عام خوش حالی، اُن کا تمدن و طرزِ معاشرت اِن کی صنعت و حرفت اور تجارت اون کا علم اور تعلیم گاہیں ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ کسی نو وارد کو فوراً اپنی طرف متوجہ نہ کریں۔ لیکن سرسید کو ان تمام چیزوں اور بالخصوص تعلیم گاہوں کو غائر نظر سے دیکھنا تھا۔ اور پھر مسئلہ تعلیم

ہندوستان کے متعلق ایک رائے قائم کرنی تھی وہ جو دیکھتے تھے اس مقصد سے اور برابر اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں۔

"جان وجناب من۔ ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ہے۔ ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی، کچھ نہ کرو اور یقین جانو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے، اور تعلیم اولاد کا کیا طریقہ ہے، اور علم کیونکر آتا ہے انشاءاللہ میں یہاں سے واپس آکر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا مگر مجھ کافر، دود و گردن مڑوڑی ہوئی مرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والی کی کون سنے گا۔

سرسید نے کیمبرج یونیورسٹی جاکر وہاں کے طریقہ تعلیم اور اصول

تربیت کا بغور مطالعہ کیا اور دوسری تعلیمی مرکزوں اور تجارتی کوٹھیوں اور صنعتی کارخانوں کے متعلق بھی معلومات فراہم کیں تعلیم نسواں کے متعلق خصوصیت سے غور و فکر کی اور مسئلہ تعلیم کے متعلق اپنی راے سب سے اول لندن ہی میں ایک انگریزی پمفلٹ میں لکھکر ظاہر کی جس میں ہندوستان کے طریقہ تعلیم کی خرابیاں تفصیل کے ساتھ ظاہر کی گئیں تھیں۔

سلسلہ مضامین | اس کے علاوہ اہل وطن کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیئے انھوں نے طویل مضامین سوسائٹی کے اخبار کو بھیجے جن میں نہایت خلوص و درد کے ساتھ ابناے وطن کو اہل یورپ کی ترقیات دولت و ثروت اور علم و دانش پر توجہ دلائی اور پھر اونکو اپنی پستی و غفلت پر متنبہ کیا۔ اِن مضامین سے اُن کی اس بیچینی کا اندازہ ہوتا ہے جو قوم کی زبون حالی اور بدنصیبی کی بدولت اُن کو ہمہ وقت رہتی تھی اور اس ولولہ خدمت کا دلپر نقش ہو جاتا ہے جو اون کا سرمایہ حیات تھی۔ نیز اُن کا یہ مقصد تھا کہ ان مضامین کے ذریعہ سے وہ اپنی آیندہ کوششوں سے ملک کو روشناس کرا دیں اور اگر ہو سکے تو اونکے لئے کچھ معاون و ہمدرد پیدا کریں۔

بہرحال اس سفر سے اِن نتائج کا ظہور یقینی تھا اور جس جذبۂ خدمت کو لیکر سرسید نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ اس کو یورپ کی ترقیات اور علم عمل کی روشنی نے اور چمکا دیا اور لندن سے واپسی پر سرسید کی زندگی یکسر ملک و قوم کے لئے وقف اور ان کی تمام ہمت وطاقت خدمت قوم میں مصروف ہو گئی۔

باب چہارم

اصلاح و ترقی تعلیم، علیگڈھ کالج

شخصی حکومت ہندوستان کا آخری دور سلطنت مغلیہ کے دور زوال کی یادگار تھا آخری نسلوں نے آنکھ کھولی تو مغل شہنشاہی کے بچے کچھے آثار، سلطنت کی عظمت رفتہ کی نشانیاں، امرار ہند اور ریاستوں اور رجواڑوں میں نظر آتے تھے، اور وہ انہی کو ظل اللہ کا پرتو سمجھتے تھے، شخص پرستی، شخصی حکومت کا لازمی نتیجہ تھا عام لوگوں کا خیال تھا کہ رفاہ عام کے کام حکومت سے وابستہ ہوتے ہیں اور بادشاہ وقت کی امداد و دست گیری کے بغیر اُن کا چلنا ناممکن ہے،

وہ پبلک کی قوت اور اسکے اثر سے واقف نہ تھے اور نہ سلاطین مغلیہ اور امراء سلطنت کے جود وعطا، فیاضی وذرہ نوازی کی داستانوں کو بھول کر کبھی تصور کر سکتے تھے کہ جب وہ دست کرم دست برد قضا سے فنا ہو جائے تو کسی شخص واحد یا جماعت کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ خیر وفلاح کا پیدا ہو سکتا ہے۔ غالباً اس زمانہ میں اُس شدید مصیبت کا اندازہ کرنا بھی ممکن نہیں جو امراء کی فیاضی وسخاوت کے دفعتۃً اُٹھ جانے سے اس طبقہ پر نازل ہوئی ہے جو ان کے ابر کرم سے سیراب ہوتا تھا، وجہ معاش کی تنگی اور گذشتہ بے فکری ومرفہ الحالی کی بدولت کسب معاش سے لاچاری ایسی صورت میں پیدا کرتی ہے جسکے روح فرسا نتائج کا حال انہیں لوگوں سے پوچھنے جن کو ان مناظر حسرت کو خود دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی یہ ہی حالت تھی۔

قومی تنزل

افلاس وتنگدستی بجائے خود ام الامراض ہے۔ سیکڑوں ہزاروں خصایص رذیلہ اس ہی ایک سبب سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب جہالت عام، تعصب وتنگ نظری گھٹی میں پڑی ہو، فرقہ بندی نے مذہب کو بازیچہ طفلاں بنا رکھا ہو، غرور اور نخوت نے دلوں کو برباد کر دیا ہو پھر اس قوم کی حالت کا

کیا پوچھنا ع

وہ قوم آج ڈوبی گی گر کل نہ ڈوبی

بالخصوص مسلمانوں کی حالت زیادہ قابل افسوس تھی اُن کو حکومت کے لُٹنے کا غم کھائے جاتا تھا۔ اُن کے دماغ سے نشۂ حکمرانی کا نکلنا دشوار تھا اُن کی غفلت اور توہم پرستی نے اُن کے قوائے عمل مضمحل کر دیئے تھے پیہم ناکامیوں اور مسلسل مصائب و تکالیف نے اُن میں مہلک قناعت پسندی پیدا کر دی تھی جو ہندوستان کی عام قدامت پرستی کے اثر سے اور زیادہ خطرناک ہو گئی۔

مذہبی خیالات | مسلمانوں نے کبھی کسی زمانہ میں اپنے مذہب کے ساتھ بے پروائی نہیں برتی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مذہبی شغف اور ذوق ہی اِن کی تمام جد وجہد کا باعث ہوا ہے۔ مذہب کی حفاظت میں انہوں نے لڑائیاں لڑیں، مذہب ہی کی نام پر قربانیاں کیں مذہب ہی کی بزرگی اور شان کے لئے انہوں نے علم وفضل کو ترقی دی اور اسی جذبۂ مذہبی کے اثر سے انہوں نے ذاتی وجاہت اور قومی عروج حاصل کیا، مذہب کا اثر اس قوم پر ایسا شدید اور سخت ہوا اور یہ نتیجہ ہے اُن کی اس محبت و شیفتگی کا جو اُنکو مذہب سے ہمیشہ رہی) کہ اُن کی اکثر خانہ جنگیاں، ذاتی عداوتوں اور مخاصمتوں کی بنیاد بھی بسا اوقات

مذہب ہی ہوتی تھی یا کم از کم وہ اپنے تعلق خاطر کے باعث اپنی ناجائز کوششوں کے لئے بھی مذہب کی آڑ پکڑتے تھے۔ اس کے علاوہ صدیوں کی اسلامی حکومت نے اُن کو قانون فقہ کی غیر معمولی اہمیت کا یقین دلا دیا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ نظام سلطنت میں مفتیوں اور فقیہوں کی اک خاص حیثیت قائم ہوگئی تھی۔

جب زوال سلطنت کا وقت آیا تو یہ اثرات بھی تنزل کی طرف مائل ہوے اور مسلمانوں کا رجحان تنگ نظری اور بیجا تعصب کی طرف ہوگیا جس کو عام جہالت وافلاس نے اور بھڑکا دیا

حکومت سے بدظنی | بدقسمتی سے حکومت جس قوم کو ملی وہ تہذیب وتمدن، مذہب وقومی خصائل میں ہندوستانیوں سے بالکل مختلف تھی زبان کے فرق نے اِن اختلافات کو اس درجہ بڑھا دیا کہ عام ہندوستانیوں کے دماغ میں اپنے حکمرانوں کی نسبت جو خیالات تھے وہ حقیقت سے کوسوں دور ایک تصویر خیالی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ طرز حکومت بھی ایسا ملا جس میں شخصی عنصر نظروں سے اوجھل، اور تسلط وحکومت ہر جگہ نمایاں تھا۔ ہندوستانی اس طریقہ سے آشنا نہ تھے، بالآخر بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔ خود انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں جو طرز عمل اختیار کیا وہ ایسا تھا کہ

اس نے ہندوستانیوں کے دلوں میں اُن سے نفرت و عداوت پیدا کردی اور چونکہ اسی زمانہ میں کمپنی کے کارندے اور گماشتے عام ہندوستانیوں سے کاروباری ضرورتوں کی وجہ سے اکثر ملتے جلتے تھے اسلئے ہندوستانیوں کی ذہن میں اُن کی جو تصویر تھی وہ اُسی زمانہ کی تھی جب کہ وہ ہندوستان کی دولت لوٹنے اور روزانہ فتنہ فساد اور خانہ جنگی کی تدابیر میں مصروف رہتے تھے۔

اسکے علاوہ پادریوں اور مسیحی مبلغوں نے تبلیغ عیسویت کا جو طریقہ ملک میں اختیار کیا اور جس میں گورنمنٹ کی امداد ہمیشہ اُن کی معین و مددگار رہی وہ اس درجہ دل آزاری اور شقاوت کا تھا کہ اگر ہندوستانی اُن سے نفرت نہ کرتے تو تعجب تھا۔

ملکی معاملات میں بھی جو جدید قوانین وقتاً فوقتاً نافذ ہوے اِن کا اثر عام طور پر ہندوستانی رعایا پر اچھا نہوا اور اکثر اُن میں قابل اعتراض اور ہندوستانی قومیت کی تحقیر پر مبنی تھی۔ یہ بھی بڑی وجہ عام ناراضی کی تھی۔

مشرق و مغرب کا تصادم | لیکن سب سے زیادہ قوی سبب ان بدگمانیوں اور عام بیچینی کا وہ کشمکش و رقابت تھی جو مشرق و مغرب کی آویزش سے ہندوستان کی سرزمین پر رونما ہوئی مغربی تہذیب جن عناصر سے

مرکب ہے وہ مشرق کی ضد ہیں۔ مشرق دنیائے آب ورنگ ہے اس کا شعار شخصی اقتدار، ذاتی شرافت اور مذہبی جذبات ہیں۔ مغرب نے تاریکی و ظلمت میں جنم لیا وطینت وحمیت کو اپنی سپر بنانے پر مجبور رہا اور اُس نے ذاتی شرافت و مذہبی جذبات کو قوم کے حوالہ کر دیا کہ وہ حسب ضرورت جس طرح چاہے قومی شیرازہ میں منسلک کر دے۔

لیکن ہندوستان مغربی حکومت کا غلام تھا اور یہ ناممکن تھا کہ تہذیب و تمدن، تعلیم و سیاسیات، غرض ہر شعبہ زندگی میں وہ مغربی اثرات سے محفوظ رہ سکے چنانچہ انقلاب عظیم اس تصادم کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اس کے نتائج بہت جلد نظر آنے لگے۔

سرسید کا مشن

سرسید نے اِن حالات کو بہت اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا اور خوش قسمتی سے اُن کو مواقع بھی ایسے ہاتھ آئے کہ وہ بغیر تذبذب کے تھوڑی سی ردو کد کے بعد صحیح نتائج تک پہنچ گئے۔

غدر کی مصیبت انہوں نے خود دیکھی اور بھگتی اسکے اسباب کو سب سے بہتر اُنہیں نے سمجھا اور لکھا انقلاب حکومت کے نتائج کا بغور مطالعہ کیا اور اپنی قوم کی بیکسی اور بیچارگی کا نقشہ اپنی آنکھوں سے

دیکھا اور اس آنے والی مصیبت کا بھی اندازہ کیا جو قومی پستی اور غفلت کی بدولت یقینی نظر آتی تھی۔

ابتداءً وہ قومی فلاح کے جن کاموں میں مصروف رہے انہوں نے اچھی طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ موجودہ صورت حال کا علاج بجز ترقی تعلیم اور کچھ نہیں، سائنٹیفک سوسائٹی نے بہت کچھ کام کیا لیکن۔ وہ قوم کے اندرونی امراض کا مکمل علاج نہ تھی، مذہبی بحث و مباحثہ، اخبارات و رسائل سب مفید ہیں لیکن وہ بجائے خود دوائے درماں نہ تھے۔ چنانچہ سفر یورپ سے واپسی کے بعد سید نے اپنے نصب العین کے لئے جو جدوجہد شروع کی اس کا اصلی محور ترقی تعلیم ہی تھا۔

مسئلہ تعلیم | ایسٹ انڈیا کمپنی میں ہندوستان میں محکمہ تعلیم کا نام نہ تھا اور نہ کمپنی نے اس مسئلہ پر کبھی توجہ کی۔ آخر زمانہ میں مشرقی علوم کی حمایت و اعانت میں کسی قدر توجہ کی گئی لیکن اس کا نتیجہ بھی بنارس و کلکتہ میں دو مدرسوں کے قیام کے سوا اور کچھ نہ ہوا لارڈ ہسٹنگز (سنہ ۱۸۱۳-۲۲) نے اپنی قوم کے اس شدید تعصب و تنگ نظری کا اعتراف کر کے ہندوستانی مدارس کی کسی قدر ہمت افزائی کی اور اسی زمانہ سے ایک دیسی اخبار بھی

نکلنا شروع ہوا۔ لیکن جب ملک پر پورا پورا تسلط ہوگیا اور استحکام حکومت کی فکر پیش آئی تو کاروبار کی ضرورت نے مجبور کیا کہ ہندوستانیوں کی تعلیم کا انتظام کیا جاے۔ ظاہر ہے کہ اِن اصولوں پر قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوتا اور نہ کوئی حکومت اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ۱۸۳۳ء میں اِن ضرورتوں کا احساس بھی قوی ہوگیا اور ہندوستان میں تعلیمی ترقی کا خیال بھی زیادہ قوت پکڑتا گیا۔ اسی سال لارڈ مکالے بہ حیثیت ممبر قانون کونسل ہند۔ ہندوستان آے تھے۔ جب یہ مسئلہ پیش ہوا تو ہندوستان کے حکمراں اسی متعصبانہ اصول پر ہندوستانی تعلیم کی حمایت پر مستعد ہوے جس کا اعتراف لارڈ ہسٹنگز کو کسی خاص مجبوری یا نیک دلی سے کرنا پڑا تھا، اور جس کو انھوں نے اِن الفاظ میں ظاہر کیا تھا کہ۔

"یہ برطانوی جذبات کے ساتھ غداری ہوگی اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ اس حکومت کا مقصد جہالت پھیلانا ہے۔ اس غرض سے کہ وہ مخلوق کے اندھے پن (جہالت) کی بدولت اپنے لئے حقیر وذلیل فوائد حاصل کرتے رہیں"

کونسل کے نزدیک معمولی انگریزی دانی کے علاوہ جدید علوم

و فنون سے ہندوستانیوں کو مطلق سروکار نہ ہونا چاہیئے تھا،
اسی غرض سے اُن کی تجویز تھی کہ تمام علوم کی تعلیم دیسی زبان میں ہو
لیکن لارڈ میکالے نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی اور اگرچہ اُن کی
مخالفت علوم مشرقی کی نسبت بدظنی پر مبنی تھی اور اسی لئے
ہندوستانی اِن کے مخالف تھے، لیکن بالآخر اُن کی رائے کو
تجربہ نے صحیح ثابت کر دکھایا اور اس وقت اُن کے اثر نے
کونسل کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان میں مغربی علوم اور انگریزی
تعلیم جاری کریں۔ یہ واقعات ۱۸۳۳ء کے ہیں اسی سال زبان انگریزی
عدالت و دفاتر کی زبان قرار پائی

لیکن اس اصول کی عملی شکل وہ مشہور فیصلہ ہے جو سر چارلس
ووڈ نے بہ حیثیت سکریٹری آف اسٹیٹ محکمہ تعلیم ہندوستان کے لئے
۱۸۵۴ء میں صادر کیا اور جس کی رو سے کلکتہ و بمبئی و مدارس کی
یونیورسٹیاں ۱۸۵۶ء میں قائم ہوئیں۔ اب علوم مغربی کا دروازہ
واقعی کھل گیا تھا اور ہندوستانیوں کے لئے کوئی امر اعلیٰ تعلیم کے
حصول میں مانع نہ تھا لیکن حکومت ہند کی تنگ نظری قطعاً دور نہیں
ہوئی تھی بلکہ قحط اور وبا کی طرح اس کی مصیبت بھی اکثر نازل ہوتی
رہتی تھی۔ چنانچہ پنجاب و الہ آباد کی یونیورسٹیاں جب قائم ہونے لگیں تو

تو اسی بحث کو از سر نو پھر اٹھایا گیا اور ۱۸۸۱ء میں لارڈ لٹن نے صاف کہدیا کہ۔

"اس ملک میں صرف دیسی زبانوں ہی کے ذریعہ سے علوم و فنون کی ترقی و اشاعت بہترین صورت سے ممکن ہے"

نیز اِن کوششوں کا سلسلہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اوسوقت سے آج تک اسی طرح جاری ہے۔ لارڈ کرزن نے اصلاح تعلیم کے نام سے کلکتہ یونیورسٹی کے حدود و اختیارات میں جو دست اندازی کی تھی وہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے اور سب سے آخر میں حکومت صوبہ متحدہ آگرہ نے جو ثانوی تعلیم میں میٹرک و اسکول لیونگ کی تفریق کی وہ بھی تازہ مثال ہے۔

تعلیم میں اس دست اندازی کا مقصد اہل ہند و بہی خواہان ترقی تعلیم ہمیشہ یہ سمجھتے رہے کہ جس تعصب و تنگ نظری نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک عرصہ تک تعلیم پر مطلقاً متوجہ نہونے دیا تھا۔ وہی جذبات دوسری صورت میں اعلیٰ تعلیم کو روکنے کے ساعی ہیں۔

سرسید اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے تھے اور اونکے سامنے

وہ حالات و واقعات بھی تھے جو برطانوی تسلط کے بعد اُنکی قوم کو پیش آرہے تھے ایک طرف وہ اپنی قوم کے بیجا توہمات، تعصب اور قدامت پسندی کے خلاف جہاد کر رہے تھے اور دوسری طرف اونکو حکومت سے ایسا معاملہ کرنا تھا کہ خطرات تصادم سے بچکر وہ اعانت و ہمدردی حاصل کر سکیں۔

آغاز کار | اس مقصد کے لئے سرسید نے لندن ہی میں بہت کچھ تیاری کر لی تھی اور جس کام کی ابتدا اونکو یہاں کرنی تھی اس کے نشیب و فراز کا کافی اندازہ کر لیا تھا۔ بلکہ ایک حد تک اس کی ابتدا بھی کر دی تھی۔ یعنی لندن ہی سے ایک تحریر بعنوان "التماس بخدمت اہل اسلام و سکام ہند در باب ترقی تعلیم مسلمانان ہند" چھپوا کر نواب محسن الملک کے پاس بھیجدی تھی کہ وہ اس کو ہندوستان میں تقسیم کرا دیں۔ لیکن اُن کو ہمت نہ ہوئی اور بالآخر سرسید نے ہی اس کو جا بجا روانہ کیا۔

تہذیب الاخلاق | جس کام کو سرسید کرنا چاہتے تھے اُس کے لئے مسلمان بالکل تیار نہ تھے اور وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جب تک ابتدا میں چند رفقا اعانت کے لئے نہ اُٹھیں اور قوم میں عام طور پر اس مقصد کا چرچا نہو اِن کا کام خوش اسلوبی سے نہیں چل سکتا نیز قوم کے

اندرونی امراض اور عام انتشار کی اصلاح وعلاج کے لیئے یہی اُن کو ضرورت تھی کہ کوئی موثر ذریعہ اختیار کیا جاے۔ اس کام کو وہ اس سے قبل بھی تھوڑا بہت کرتے رہے تھے لیکن اب چاہتے تھے کہ پورے زور وقوت سے تحریک اصلاح کو شروع کیا جاے اور وہ سب کچھ جو وہ اپنی قوم سے کہنا چاہتے ہیں برملا کہیں اور پوری طاقت سے مطالبہ اصلاح کریں۔ اس مقصد سے اُنہوں نے اخبار تہذیب الاخلاق جاری کیا۔

تہذیب الاخلاق نے اصلاح معاشرت اور مذہب وتمدن واخلاق پر خصوصیت سے زور دیا۔ عام مسلمانوں کی قدامت پسندی کو اسکے مضامین سے سخت ٹھیس لگتی تھی اسی لئے اختلاف ورنجش کا طوفان اُمنڈ آیا اور مذہبی اختلافات نے ایک نئے فتنہ کی صورت اختیار کرلی لیکن یہ ضرور ہوا کہ اصلاح کی آواز اطراف ہند میں مسلمانوں تک پہنچ گئی اور ایک محدود جماعت ایسی بھی پیدا ہوگئی جو سرسید کے مقاصد سے ہمدردی رکھتی تھی۔

کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان

اسی زمانہ میں سرسید نے بعض امراء و با اثر مسلمانوں کو متوجہ کرکے ایک "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" قائم کی اس کمیٹی نے اول ایک انعامی مضمون کا

اعلان کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مضمون نگار ان امور سے بحث کریں جن کے باعث مسلمانوں میں انگریزی تعلیم مقبول نہیں ہوتی، سرکاری مدارس اور کالجوں میں وہ اپنی اولاد کو بھیجنا پسند نہیں کرتی، علوم قدیمہ اِن میں کیوں گھٹ گئے وغیرہ وغیرہ۔

انعامی مضامین کی تعداد ۳۲ تھی جو مقابلہ میں آئے اور ان میں سے تین کو انعام دیا گیا۔ اِن مضامین پر غور و فکر کے بعد کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ مسلمانوں کا وہ تعصب جس کی بنا پر وہ مغربی تعلیم سے گریز کرتے ہیں قابل افسوس ہے، لیکن موجودہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں جو تعلیم مروج ہے وہ بھی اعتراضات سے نہیں بچ سکتی اور نہ مسلمانوں کے لیئے وہ صحیح طریق تعلیم ہے، اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق خود ایک دارالعلوم قایم کریں جس میں علوم مشرقی و مغربی کی تعلیم کے ساتھ مذہبی و قومی تعلیم کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ کمیٹی نے مجوزہ درس گاہ کی ایک اسکیم بھی اسی تجویز کے ساتھ شائع کی۔

کمیٹی خزینتہ البضاعتہ | اسی کے ساتھ ایک کمیٹی خزینتہ البضاعتہ کے نام سے فراہمی سرمایہ کے لیئے قایم کی گئی اور کمیٹی مذکور نے اپنے کام کو نہایت محنت و خوبی سے انجام دینا شروع کیا۔ یہ دونوں کام خود

سرسید ہی کی نگرانی میں اور انہیں کے بھروسہ پر چل رہے تھے جب دونوں کمیٹیاں اپنے مقاصد میں نہایت کامیاب ہوئیں اور توقع سے زیادہ سرمایہ بھی فراہم ہوگیا تو سرسید نے مسلمانوں سے ۱۸۷۲ء میں بذریعہ ایک اعلان کے استفسار کیا کہ مدرستہ العلوم کہاں قایم ہونا چاہیے اور بالآخر کثرت رائے سے قرار پایا کہ علیگڈھ ہی میں مدرسہ قایم ہو۔

عام مخالفت | تہذیب الاخلاق کی اشاعت ہی نے عام مخالفت پیدا کردی تھی اور جن مقاصد کی تہذیب الاخلاق تبلیغ کر رہا تھا وہ مسلمانان ہند کے جذبات وخیالات ومعتقدات کے قطعاً خلاف تھے اور جو فی الوقت خلاف نہ بھی تھے اُن کو رسم ورواج توہمات اور قدامت پسندی کو اثر نے عرصہ ہی اسلامی سوسائٹی سے خارج کر دیا تھا، مغربی تعلیم، یورپ کی ترقی وتہذیب کی داستانیں، رسم ورواج اور تقلید کی مخالفت اور مذہبی اختلافات ہی تہذیب الاخلاق کے مباحث تھے اور ان سے ہندوستان کے مسلمانوں کے کان آشنا نہ تھے۔ بلکہ وہ ان خیالات کی اشاعت وتبلیغ کو صریح بے دینی اور لامذہبی سمجھتے تھے

جب اسی مرکز سے مدرستہ العلوم کی صدا اُٹھی تو اونھوں نے اس کی مخالفت بھی زور شور سے شروع کر دی۔ بجز چند اخبارات کے

جن میں ایک دو کے علاوہ سب غیر مسلم تھے سب نے مدرسہ کی مخالفت شروع کی اور اس کے محرک یعنی سرسید کی مخالفت میں اپنے صفحات وقف کر دیے۔ کانپور سے خصوصیت کے ساتھ دو اخبار نور الانوار اور نور الآفاق سرسید کی مخالفت میں جاری کئے گئے، ہر جگہ ان پر کفر و الحاد کے فتوے دیے گئے اور اس مدرسہ کو زندقہ اور الحاد کی درس گاہ قرار دیا گیا۔ رفتہ رفتہ مدرسہ کی مخالفت اس حد تک پہنچ گئی کہ اس کے بڑے بڑے حامی دل چھوڑ بیٹھے اور بظاہر یہ کشتی ساحل مقصود تک پہنچتی نظر نہ آتی تھی۔ لیکن اس مخالفت کے طوفان کا سرسید پر مطلق کوئی اثر نہ تھا بلکہ بخلاف اس کے، اُن کی ہمت وسعی روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور جس نصب العین کو وہ حاصل کرنا چاہتے تھے اس کی رفعت و بلندی ان کو زیر قدم خس و خاشاک پر توجہ کرنے کی مہلت ہی نہ دیتی تھی، اور وہ اپنی مخالفت سے بجائے ملول و افسردہ ہونیکے اور زیادہ مستعد و سرگرم ہوتے جاتے تھے،

ابتدائی مدرسہ | بالآخر اس مخالفت و آیندہ کے خطرات سے بچنے کے لئے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی تجویز سے یہ قرار پایا کہ مدرسہ کی ابتدا ایک چھوٹے اسکول سے کر دینی چاہیئے تاکہ نصاب تعلیم اور طریق تربیت کو دیکھ کر مسلمان خود فیصلہ کر سکیں کہ آیا یہ اصول تعلیم اُن کے

فرزندوں کے لئے مناسب ہے یا نہیں اور یہ کہ کفر والحاد کی کیا باتیں اس مدرسہ میں ہیں جن کی وجہ سے یہاں کے طلبہ نیچری اور کرشان بننے پر مجبور ہوجاتے ہیں

چنانچہ مئی ۱۸۷۵ء میں مدرسہ کا افتتاح ہوا اور جون ۱۸۷۵ء سے ابتدائی تعلیم باضابطہ شروع ہو گئی۔

علیگڑھ کا سنگ بنیاد ابتدائی مدرسہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب سب جج علی گڈھ کی نگرانی میں جاری رہا اور سرسید بنارس میں اپنی کمیٹیوں کے کام کو ترقی دیتے رہے۔ لیکن مدرسہ کی ترقی اور اپنے مجوزہ کالج کے قیام کے خیال سے وہ جلد ہی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور جولائی ۱۸۷۶ء میں پنشن لیکر مستقل قیام کے ارادہ سے علی گڈھ آگئے اور ہمہ تن قیام کالج کی تجاویز اور دوسری قومی کاموں میں منہمک ہو گئے۔ چنانچہ تھوڑی مدت میں اُن کی کوششیں اس حد تک کامیاب ہوئیں کہ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن نے علی گڈھ آکر مجوزہ کالج کا سنگ بنیاد نصب کیا۔

کالج کا تخیل جس دارالعلوم کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں رکھی گئی اس کو مسلمانوں کا ایک کالج کہنا گو امر واقعہ کے خلاف نہیں۔ لیکن حقیقت سے دور ہے یہ مسلمانوں کا ایک مدرسہ نہ تھا بلکہ سید محمود جنہوں نے سب سے پہلے

مجوزہ کالج کی اسکیم تیار کی آخر تک اس بات پر لڑتے رہے کہ اس کو
نہ کالج کا نام دیا جائے اور نہ یہ ایک محدود درس گاہ قرار دیجائے
خود سرسید کا بھی یہی خیال تھا اور اُن کے اکثر ہوا خواہ و مددگار
یہی چاہتے تھے کہ علی گڈھ کو مسلمانوں کا ایسا تعلیمی مرکز ہونا چاہیئے
جہاں وہ اپنی تعلیم کا انتظام اپنی قومی کیرکٹر اور ذہنیت کے مطابق
خود اپنے ہاتھوں سے کریں اور دخل غیر کو اس میں مطلق راہ نہو، نیز
اعالی تعلیم کو اس حد تک فروغ دیا جائے کہ مسلمانون کی گذشتہ
علمی عظمت دوبارہ تازہ ہو جائے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ علی گڈھ
اپنے اقتدار کو اس طرح کام میں لائے کہ اُس کی مشعل علم اطراف،
ہند میں مسلمان گھروں کے علمی چراغ روشن کرے اور مسلمانوں میں
وہ بصیرت اولوالعزمی اور بلند نظری پیدا ہو جائے جو اُن کو ترقی یافتہ
قوموں میں اپنی جگہہ پیدا کرنی کے قابل بنائے اور اُن کی قدامت
پسندی، تنگ خیالی اور توہمات کو دور کر سکے ان مقاصد کے اعتبار سے
علی گڈھ کو کم از کم یونیورسٹی ہونا ضروری تھا اور سرسید نے اسی
نصب العین سے ابتدائی مدرسہ کا افتتاح کیا تھا، اسی مقصد سے
انھوں نے بہت بڑے رقبہ زمین کو مجوزہ کالج کے لئے خرید کیا اور
اسی نظر سے وسیع و عالیشان عمارتوں کی بنیاد ڈالی۔

لیکن علوم و فنون کی کثرت یا عمارتوں کی رفعت و شان خواہ یونیورسٹی بنانے میں کامیاب ہو جائے مگر علی گڈھ کے صحیح نصب العین تک وہ بھی نہیں پہنچتی علی گڈھ کو صرف یونیورسٹی بنا دینا ہی کافی نہ تھا بلکہ اسکے لئے ضرورت تھی کہ مسلمانوں کی تعلیمی، سیاسی، معاشرتی اور تمدنی ہر قسم کی اصلاح کا مرکز ہو اور اس مقصد کے لئے نصاب تعلیم میں ایسی ترمیم اور طریق تربیت میں ایسا ڈھنگ اختیار کرنا لازمی تھا جو طلبا، علیگڈھ کو محض ڈگریوں کے شوق سے نہیں بلکہ اصلاح و ترقی کے خاطر تعلیم پر آمادہ کرے اور بعد فراغت ان میں وہ جوش پیدا ہو جائے کہ وہ جہاں جائیں اپنی قوم کا درد ان کو چین سے نہ بیٹھنے دے اور وہ اپنی قوم کی اصلاح و فلاح کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرتے رہیں۔

اگرچہ عملی دشواریوں نے علی گڈھ کو فوراً یونیورسٹی نہیں بننے دیا لیکن جس تیزی سے وہ اپنے مقصد کی طرف بڑھتا گیا وہ تاریخ ترقی تعلیم میں اک غیر معمولی مثال ہے۔

قیام کالج | ابتدائی مدرسہ کو قایم ہوئے ابھی تین برس بھی نہ ہوئے تھے کہ یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج کلاس قایم ہو گئے اور ۱۸۸۱ء میں ایم اے تک اور ۱۸۸۳ء میں قانونی امتحانات بھی

کھول دیے گئے۔ چنانچہ ایک مقصد یعنی مسلمانوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کا انتظام تو اس قدر قلیل مدت میں پورا ہوگیا۔ لیکن سرسید کا مشن اِن منازل کی تکمیل پر نہیں بلکہ ان کے نتائج سے متعلق تھا اس لئے اس کا وقت ابھی کچھ دور رہتا۔

باایں ہمہ سرسید اپنے مقصد اور اصلی نصب العین سے غافل نہ تھے، اپنی قوم کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا۔ اسکے ساتھ وہ قوم میں عام بیداری اور اصلاح کی کوششوں میں برابر مصروف رہے اور تہذیب الاخلاق، ایجوکیشنل کانفرنس سیاسی جدوجہد، اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ سے وہ برابر اپنا کام کرتے رہے۔

عام مخالفت کے ثمرات — جس مخالفت کا سرسید کو مقابلہ کرنا پڑا، اور اپنی خدمات قومی کا جو صلہ اُن کو قوم کی طرف سے دیا گیا وہ کتنا ہی ہمت شکن کیوں نہ ہو، لیکن عام مخالفت نے سرسید کے مشن کو غیر معمولی وغیر متوقع امداد بھی پہنچائی چونکہ مخالفت کا یہ عالم تھا کہ جا وبیجا ہر تجویز ورائے کی قوم کی طرف سے مخالفت ہوتی تھی اس لئے سرسید اور اُن کے رفقاء کو جوابی کارروائیوں میں غیر معمولی ہمت وسعی سے کام لینا پڑتا تھا اور غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے مستقل ایک محکمہ کام کر رہا تھا جس کی روح رواں بھی سرسید

ہی تھے۔ اِن کوششوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفت کا سیلاب رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا اور کالج کی ترقی کے ساتھ جو گروہ اس کا حامی اور طرف دار تھا اُس نے ایسی ترقی کی کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد مخالفت کا کوئی خوف باقی نہ رہا۔ اور جن خطرات کا آگے چل کر اندیشہ ہو سکتا تھا ان کو رفع کرنے کی تدابیر بھی فوراً شروع ہو گئیں۔

موجودہ علیگڈھ | جس زمانہ میں سرسید نے اپنی قوم کو تعلیم پر متوجہ کیا اُن کو سوسائٹی کے مضر اثرات اور رسم و رواج کی خطرناک راہوں سے آگاہ کیا مسلمانوں کی حیثیت اجتماعی بمنزلہ صفر کے رہ گئی تھی، قومیت اور جمعیت اُن سے فنا ہو چکی تھیں، ذاتی اثر اور تشخص نے ایک مذموم صورت اختیار کر لی تھی۔ حکومت چھن جانے کے بعد اُن کی سوسائٹی معایب و معاصی کا گنجینہ بن گئی تھی، جہالت اور تعصب نے آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا تھا عام تعلیم مفقود تھی اور جو کچھ بُری بھلی ہوتی تھی وہ امرا میں ناز و تنعم کی بدولت اور علما میں فرقہ بندی اور تنگ نظری کے باعث بجائے نفع کے مضرت رساں ثابت ہوتی تھی، عربی کی تعلیم چند درسی کتابوں کے محدود مطالب تک رہ گئی تھی فارسی کثرت سے پڑھائی جاتی تھی مگر وہ شعر و شاعری کے سطحی بیان یا عروض و انشا کے قواعد سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ انگریزی تعلیم کا نام نہ تھا

یعنی ۱۸۷۵ء تک تمام ہندوستان میں صرف ۲۰ بیس مسلمان گریجویٹ پیدا ہوئے تھے، قدامت پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنے فرسودہ خیالات اور دور از کار توہمات کے خلاف کسی دلیل اور حجت کو خواہ کیسی ہی بدیہی اور قطعی ہو، اُن کا قبول کرلینا کفر و الحاد کے مرادف تھا۔ خود علمار اور طالبین علم کے سامنے اگر کسی علمی مسئلہ میں ان کی ہم آہنگ جماعت کے خلاف کوئی رائے پیش کیجاتی تھی تو وہ اس کے سننے کے بھی روادار نہ تھے اس قسم کی تنگ نظری علمی مسائل میں بلاشبہ جہالت کے قریب پہنچتی ہے۔ ان حالات میں اگر سرسید اپنی قوم کو تعلیم پر متوجہ کرنے میں کامیاب ہوجائیں اور قوم کو اس پر آمادہ کرلیں کہ وہ اپنے قدیم توہمات کو چھوڑ کر جدید اصول پر تعلیم حاصل کرے نیز اُن میں جذبہ قومی اس قدر پیدا ہوجائے کہ وہ اس بڑے کام میں ان کو اس حد تک امداد دے کہ مدرسہ کی بنیادیں قایم ہوجائیں اور اُس کی سر بفلک عمارات تیار ہوجائیں تو بلاشبہ کہنا پڑتا ہے کہ ع این کار از تو آید و مردان چنیں کنند

لیکن سید کی خدمات کی فہرست علیگڈہ کالج کے وجود ہی پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس کی ذیل میں ہم کو وہ بیشمار قابل ذکر خدمات نظر آتی ہیں جو باعتبار اپنی اہمیت و افادہ کے اتنی ہی وسیع اور

اہم ہیں جیسا کہ خود علیگڈھ کالج کا وجود۔

گذشتہ پچاس سال میں مسلمانان ہندوستان کی سیاسی جدوجہد، علمی ترقی، تمدن و معاشرت کی اصلاح، قومیت و جذبہ وطنیت، غرض ہر شعبہ زندگی میں جو سعی و ترقی نمایاں ہے اس کا سہرا یقیناً علیگڈھ کے سر ہے اور اس کی ابتدار بالیقین سرسید کے اُن کاموں میں نظر آتی ہے جن کو اُن کی تنہا کوششوں نے علیگڈھ سے شروع کیا اور جن کی دھندلی نشانیاں اب بھی تہذیب الاخلاق، ایجوکیشنل کانفرنس، ترقی زبان و ترقی علوم، اصلاح اخلاق، و ادب و شعر آزادیِ فکر وغیرہ میں پائی جاتی ہیں۔

علیگڈھ کی تعمیر | علیگڈھ کالج کی ابتدا ۱۸۷۵ء میں ہوئی اور چند ہی سال کے بعد یعنی ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن نے اس طفل مکتب کی نسبت یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "بعض اعتبارات سے یہ کالج سب انسٹیٹیوشنوں سے بہتر اور اعلیٰ درجہ کا انسٹیٹیوشن ہے" یہ مرتبہ اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے علیگڈھ کالج کو جن منازل سے گزرنا پڑا اُن میں ہر ہر قدم پر جس دست و بازو نے اُس کی رہبری کی ہے وہ سرسید ہی کا ہاتھ تھا۔ وہ کالج کمیٹی کے ابتدائی کام اصول چندہ کا انتظام، اساتذہ کی فراہمی، طلبہ کی نگرانی، عمارات کی تعمیر، حسابات کی ترتیب

اور دفتر کی تنظیم غرض ہر کام کو بہ نفس نفیس کرتے تھے اور ہر کام بجائے خود
اس قدر اہم اور نازک تھا کہ اُن کو بے انتہا توجہ اور احتیاط کی ضرورت
پڑتی تھی، اِن مشاغل اور مصروفیتوں کے علاوہ تصنیف و تالیف
اور اخبارات میں مذہبی و علمی مباحث بھی جاری تھے اور یہ بھی تمام و کمال
انہیں کے زور قلم اور قوت فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔

مسئلہ تعلیم اور سرسید — سرسید مسئلہ تعلیم کی نسبت اپنے زمانہ کی ضروریات
کے لحاظ سے اک خاص راے رکھتے تھے اور اونکو زمانہ حال کا مسلمہ
ایجوکشنسٹ (ماہر تعلیم) قرار دینا بیجا نہیں۔ مسئلہ تعلیم میں سب سے پہلے
اُنہوں نے زمانہ قیام لندن میں مسئلہ تعلیم ہندوستان کے متعلق
اپنی مفصل و مبسوط راے انگریزی زبان میں شایع کی اور پھر وقتاً فوقتاً
وہ اس معاملہ میں اپنی راے نہایت جرٲت و آزادی سے ظاہر
کرتے رہے اور تعجب ہوتا ہے کہ باوجود ملازمت کی پابندیوں اور محکومیت
کے اثر کے ہمیشہ اُنہوں نے مسئلہ تعلیم میں گورنمنٹ سے مخالفت کی
وہ اپنی قوم سے بھی برابر اختلاف کرتے رہے اور اپنی تجاویز
کو قوم میں مقبول بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔

سرسید نے ہمیشہ اعلیٰ تعلیم مغربی کی حمایت کی اور اُن کا عقیدہ تھا
کہ جب تک ہندوستان جدید اصولوں پر اعلیٰ ترین تعلیم سے

بہرہ اندوز ہو اُس میں علو ہمت اور رفعت خیال پیدا نہیں ہوسکتی
اور بغیر اس جذبہ کے تمام کوششیں جو قومی ترقی کے لئے کی جائیں
وہ کچھ زیادہ سودمند ہوں گی۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول میں جس قدر
موانع و دشواریاں پیدا ہوتی تھیں اُن سب کا وہ مردانہ وار مقابلہ
کرتے تھے اور اسی وجہ سے مشرقی علوم کی ترقی اور صنعتی تعلیم کے
شوق کو حالات موجودہ کے لحاظ سے وہ مفید نہیں سمجھتے تھے چنانچہ
پنجاب میں جب مشرقی علوم کی ترقی کے لئے گورنمنٹ نے یونیورسٹی کی
تجویز پیش کی تو سب سے پہلے سر سید ہی اس کی مخالفت کی، وہ
اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

ہم کو نہایت ہوشیاری سے دیکھنا چاہئے کہ جو کچھ کیا جاتا ہے
اور کہا جاتا ہے کہ ہمارے اور ہمارے ملک کی بہبودی
و ترقی کے لئے ہے ایسا نہو کہ صرف دھوکا ہو۔ ہم کو اس وقت
پچھلے زمانہ کے قصہ اور کہانیوں کو یاد دلانا اور کہنا کہ ایشیا
میں ایشیائی سلطنت کے زمانہ میں علوم و فنون کیا تھی
اور اُن کے وقت میں اُن کو کیسی ترقی اور کیسی سرسبزی تھی
محض بے فائدہ ہے۔ ہم کو اپنے زمانہ کی حالات پر جو
گورنمنٹ انگلشیہ کی حکومت کا زمانہ ہے، غور کرنا اور

اُسکو ہندوستانی ہی کے حدود میں محدود رکھنا ہمارے لئے
زیادہ مفید اور زیادہ تر کار آمد ہے۔

اسی سلسلہ میں آگے چل کر کہتے ہیں۔

"ہم نہایت سچائی سے اور گورنمنٹ کی دلی خیر خواہی سے
بتانا چاہتے ہیں کہ سمجھدار اور دور اندیش ہندوستانی
ان تمام کارروائیوں سے گورنمنٹ کی نسبت کیا خیال
رکھتے ہیں! نہایت بدخیال اُن کے دل میں پیدا ہوتا ہے
چند سال گذرے (یعنی یونیورسٹیاں قائم ہونے سے پہلے
جبکہ مشرقی علوم کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا) کہ اُن کو یقین
کامل تھا کہ گورنمنٹ کو درحقیقت ہم کو واقعی تعلیم دینا
منظور نہیں ہے اور وہ ہم کو اُسی قدر تعلیم دینا چاہتی ہے
جس قدر کی اُس کو ضرورت ہے وہ ہم کو ایسا مرکب بنانا
چاہتی ہے کہ اسباب لاد کر ایک جگہہ سے دوسری جگہہ
پہنچا دے۔ اس کو انتظام ملک اور انتظام دفتر کے لئے
چند ایسی پتلیاں درکار ہیں جو انگریزی لکھہ سکتی ہوں
مگر سمجھہ نہ سکتی ہوں، جیسے کہ مانچسٹر میں سوت کاتنے کے لئے
پتلیوں کی ضرورت ہے۔ جو کچھہ کہ وہ (یعنی گورنمنٹ)

ہندوستان میں تعلیم کی نسبت کرتی تھی کوئی اُس کا شکرگزار نہ تھا۔ اس لئے کہ اس کو خودغرضی پر محمول کیا کیا جاتا تھا نہ رعایا پروری پر۔

کچھ بہت عرصہ نہیں گزرا (یعنی جب کہ ہندوستان میں یا کلکتہ، بمبئی اور مدراس یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں) کہ ہندوستانیوں میں سے یہ بدخیال دور ہوا تھا اور ہندوستانی یہ یقین کرتے تھے کہ گورنمنٹ نے اپنی پالیسی بدل دی ہے اور درحقیقت اُس کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینا مقصود ہے، مگر ہندوستانی خوب سمجھتے ہیں کہ تھوڑے دنوں سے بعض مدبران سلطنت کی پالیسی پھر بدل گئی ہے اور ہندوستانیوں کو اب اعلیٰ درجہ کی حقیقی تعلیم دینا وہ مناسب نہیں سمجھتے۔

اس کے بعد اُنھوں نے علوم مشرقی کے متعلق خصوصیت سے ایک مضمون میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"بنارس کالج نے سنسکرت زبان کی ترقی پر بہت توجہ کی مگر وہ ایک کو بھی سنسکرت میں اُن پنڈتوں کی برابر نہیں بنا سکا جو دھوتی باندھے، کمری پہنے منگتا اور شوالہ گھاٹ کی

سیڑھیوں پر بیٹھکر اپنی مقدس زبان سنسکرت کو تحصیل
کرتے ہیں مگر اُن کی تحصیل سے ملک بجز اس کے کہ بنارس
میں دس پانچ منگتا پنڈت اور زیادہ ہو گئے کیا نتیجہ
حاصل ہوا ہے یونیورسٹی کالج لاہور نے بلخ و بدخشان کے
طالب علموں کو جو کچھ تعلیم دی ہو، دی ہو ہم کو اس کا
حال معلوم نہیں، مگر آج تک (ہندوستان میں) اُس نے
ایک کو بھی عربی یا فارسی میں اُن لوگوں کے برابر نہیں بنایا
جنھوں نے مسجد کے چبوتروں اور خانقاہ کے تنگ و تاریک
حجروں میں بیٹھ کر اور درود و فاتحہ کی روٹی پر گزران کر
کر عربی و فارسی کو تحصیل کیا اور اعلی درجہ کا تبحر اُن میں
پیدا ہو گیا۔ مگر اس کا نتیجہ بجز اس کے کہ مُردوں کی روٹیاں
کھانے والے اور زیادہ ہو گئے، ملک کو کیا فائدہ پہنچایا
اگر پنجاب یونیورسٹی قائم ہو جاوے اور ہم کو علوم مشرقی
میں ویسی ہی تعلیم دے (گو ویسی تعلیم بھی ممکن نہیں) تو بجز
اس کے کہ چند بھکاری اور چند فاتحہ کی روٹی کھانے والے
ملک میں زیادہ ہو جائیں اور کیا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے
ہم کو صاف صاف بتاؤ کہ لاہور یونیورسٹی کالج نے جن

لوگوں کو پروفیشنی اور ہائی پروفیشنی کے خطاب مرحمت
فرماے ہیں وہ کس مرض کی دوا ہیں اُن سے ملک کو قوم کو
اس کی دولت کو، اُس کی حکومت کو، اوس کی تجارت کو
اُسکے اخلاق کو، اُس کی روشن ضمیری کو اور اس کی وسعت
خیالات کو کیا فائدہ پہنچا، یا آئندہ پہنچ سکتا ہے! ہاں
اگر یہ کہا جاے کہ اس تعلیم سے مقصد ہی یہ ہے کہ ایسے
نہ ہونے پائیں تو سب کچھ تسلیم کیا جا سکتا ہے"
اِن ہی خیالات کا اثر سے حکومت شمال و مغرب بھی متاثر تھی
اور گورنمنٹ نے اعلی تعلیم کا جو انتظام کلکتہ و مدراس و بمبی کی
یونیورسٹیاں قایم کرکے کیا تھا وہ اب آنکھوں میں کھٹک رہا تھا
اور گورنمنٹ کی پالیسی اب نئی کروٹ لینا چاہتی تھی، چنانچہ
پنجاب یونیورسٹی کے قیام کے زمانہ میں سرسید نے اس خطرہ کو اچھی طرح
سمجھ لیا تھا اور جب الہ آباد میں یونیورسٹی کی تجویز ہوئی اس وقت
پھر اس خطرہ نے دوبارہ جنم لیا، سرسید نے اس کا بھی مقابلہ
اپنی مخالفت سے کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

ہم اپنا یقین ظاہر کرتے ہیں کہ الہ آباد یونیورسٹی
پنجاب یونیورسٹی کی بہن نہیں ہو سکی۔ وہ انگلش

ہائی ایجوکیشن کے لئے بمنزلۂ ایک مادرِ مہربان کے ہوں گی،
لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ ہمارا خیال غلط ہے تو یہ سوال
پیش آتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے؟ ہماری رائے میں
اس کا جواب صاف ہے' استقلال' استقلال' استقلال
ہمت' ہمت' ہمت' کوشش' کوشش' کوشش' ہمکو
گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیئے اور خود
اپنے لئے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی
کوشش کرنی چاہیئے، اور اگر ہم میں سیلف رسپکٹ کا
کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیئے کہ بلاشبہ
گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی
رایوں پر نہیں۔

سرسید کی اِن تحریروں سے معلوم ہوتا ہے وہ جدید تعلیم میں
علوم مشرقی کے یکسر مخالف تھے، اور قدیم طرزِ تعلیم کو محض لغو
اور بے سود قرار دیتے تھے، لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے وہ
بلاشبہ قدیم طریقۂ تعلیم میں مناسب ترمیم اور نصابِ تعلیم میں
ضروریاتِ زمانہ کے مطابق تبدیلی چاہتے تھے لیکن وہ ہندوستانیوں کو
اِن علوم سے بے بہرہ رکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہندستانی

زبان کے ذریعہ سے ابتدائی تعلیم کے مخالف تھے۔ البتہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ محض قدیم طریقہ تعلیم اور اپنی ہی زبان پر اکتفا کیا جائے۔ ایجوکیشن کمیشن کی شہادت میں انہوں نے اس مسئلہ کو اور زیادہ صاف کر دیا ہے، ہندوستانی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کی متعلق انہوں نے بیان کیا کہ۔

"ان ورنیکلر و انگریزی پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جنکا مقصد طالب علموں کو اعلی درجہ کی تعلیم کے واسطے طیار کرنیکا نہین ہے۔ مغربی علوم کا جہاں تک کہ وہ ان میں پڑہائے جاتے ہیں ورنیکلر زبان میں پڑہایا جانا بیشک ملک کے حق میں بہتر ہوگا۔ مگر انگریزی ابتدائی اسکولوں میں جو اس غرض سے قائم کئے گئے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے واسطے بطور ایک زینہ کے کام دیں ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے یورپین علوم کو پڑہانا تعلیم کو برباد کرنا ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں وہی شخص ہوں جس نے سب سے پہلے اس بات کا گمان کیا تھا کہ یورپین علوم کا ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے تحصیل کرنا ملک کے حق میں زیادہ سودمند ہوگا۔ میں وہی شخص ہوں جس نے لارڈ مرکالے کے منٹ ۱۸۳۵ء پر نکتہ چینی کی تھی کہ انہوں نے

مشرقی تعلیم کے نقص کو ظاہر کیا اور مغربی علوم کی تعلیم پر توجہ دلائی
اور اس بات کے خیال کرنے سے قاصر رہا تھا کہ دیسی زبانوں
کی وساطت سے یوروپین علوم کی اشاعت اہل ہند کو
کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے یا نہیں ؟ سید نے اپنی راے کو
صرف بیان ہی پر محدود نہیں کیا بلکہ اس کو عمل میں لانیکی
کوشش کی۔ بہت سے مباحثے مختلف جلسوں میں کیے،
اس مضمون پر متعدد رسالے اور مضامین لکھے، لوکل اور
سپریم گورنمنٹ کو عرضداشتیں بھیجیں اسی غرض سے
ایک سوسائٹی موسوم بہ سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ میں
قایم کی گئی جس نے کئی علمی اور تاریخی کتابوں کا انگریزی سے
ورنیکلر زبان میں ترجمہ کیا۔ مگر انجام کار میں اپنی راے کی
غلطی کے اعتراف سے باز نہ رہ سکا۔

سرسید نے حکومت کی امداد اور دست اندازی متعلق تعلیم کی
نسبت بھی اس کمیشن میں اپنی راے ظاہر کی ہے وہ کہتے ہیں کہ
اس امر کی نسبت جو میری خاص راے ہے وہ پبلک فیلنگ کے
برخلاف ہے میں نے اس معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کامل
کرنیکے بعد اپنی راے قایم کی ہے کہ جب تک خود لوگ

اپنی تعلیم کا تمام اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اُس وقت تک مناسب طور پر اُن کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پس ملک کے لئے یہ زیادہ تر مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علیحدہ ہوجاے مگر پبلک کی راے اس کی موید نہیں ہے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ ابھی وقت نہیں آیا کہ گورنمنٹ کا اس تعلیم سے علیحدہ ہونا واجب ہو ....

اس مقام پر میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خود میرے ساتھ گزرا ہے۔ یعنی جس زمانہ میں کہ محمدن اینگلو اورینٹل کالج علیگڈھ قایم ہوا تو میں نے ایک نہایت معزز یوروپین افسر سے اُس کی امداد کی درخواست کی۔ اُس نے جواب دیا کہ " ہم پر اس کی مدد کرنا کچھ فرض نہیں ہے۔ وہ تمہارا بچہ ہے ہمیں اس کو دھکا دیدینا چاہئے۔ اگر ہمارا بچہ ہوتا تو ہم البتہ اُس کو والدینی شفقت کے ساتھ چھاتی سے لگا لیتے " پس پبلک اوپنین کے لحاظ سے میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے واسطے اس بات کا کہنا کچھ آسان نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنی تعلیم کا خرچ اپنے آپ

برداشت کرنا چاہیے۔

مسئلہ تعلیم نسواں کے متعلق سرسید خاص رائے رکھتے تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے براہ راست تعلیم نسواں کے لئے کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ لیکن زمانہ نے بتا دیا کہ اُن کی رائے یقیناً صحیح تھی اور جن نتائج کی وہ توقع رکھتے تھے، اب ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے کمیشن کو اپنی رائے سے اِن الفاظ میں مطلع کیا تھا کہ۔

عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ اس فلاسفر کے سوال سے نہایت مشابہ ہے جس نے پوچھا تھا کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی یا انڈا جن شخصوں کی یہ رائے ہے کہ مردوں کی تعلیم سے پہلے عورتوں کی تعلیم ہونی چاہیئے وہ بڑی غلطی پر ہیں حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اُس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے تو اس وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے وہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے کافی ہے۔ جو کچھ بالفعل گورنمنٹ کو

کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کی بہ نسبت ہندو
کی جانب کافی توجہ کرے۔ جبکہ مسلمانوں کی موجودہ نسل
بخوبی تعلیم و تربیت یافتہ ہوجائے گی تو مسلمان عورتوں کی
تعلیم پر اُس کا ضرور بالضرور ایک زبردست گو خفیہ
اثر پہنچے گا۔

ایجوکیشنل کانفرنس | سرسید نے مسئلہ تعلیم پر جس قدر غور کیا تھا اور
جس مقصد کے حصول میں وہ لگے ہوئے تھے اس کی کامیابی کا دارو مدار
محض علیگڈھ کالج یا مسلم یونیورسٹی پر نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اچھی طرح
جانتے تھے کہ چھ کرور مسلمانان ہند کی تعلیم کا انتظام کسی ایک مرکز سے
نہیں کیا جاسکتا اور نہ یہ ممکن ہے کہ جس اعلیٰ تعلیم کا سامان علیگڈھ
میں کیا گیا ہے وہ جمہور مسلمانان ہند کی مختلف ضروریات کے لئے
کافی ہو۔ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کو اُنکی آیندہ علمی ترقیات اور تعلیمی
بیداری کا سنگ بنیاد قرار دینا بیجا نہیں لیکن محض اعلیٰ تعلیم ہی اس مقصد
کا ذریعہ نہیں قرار دیا جاسکتا تھا مسلمانوں میں جس تعلیمی بیداری کی
ضرورت تھی اور جن موانع و مشکلات کا مقابلہ ضروری تھا اسکے لئے
ایک جداگانہ نظام کی ضرورت تھی اور اسی مقصد سے سرسید نے
۱۸۸۶ء میں محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ میں

قایم کی۔

کانفرنس کا پہلا اجلاس علیگڈھ میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس کے مقاصد ابتدا، میں حسب تفصیل ذیل تھے۔

(۱) مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی اشاعت (۲) مسلمانوں کے انگریزی مدارس میں تعلیم مذہبی کی نگرانی و ترقی (۳) علوم مشرقی و تعلیم مذہبی کے موجودہ مدارس کی ترقی و استحکام کی تدابیر (۴) مکاتب قرآن خوانی کی وسعت و ترقی میں کوشش۔ اِن مقاصد کے علاوہ کانفرنس کی ترقی اور ہر دلعزیزی کے ساتھہ دوسری ضروری کاموں پر بھی توجہ شروع کی گئی اور (۱) تعلیم نسواں (۲) فراہمی کتب نادرہ و قلمی کتبہ جات (۳) اشاعت و ترقی اردو وغیرہ دوسرے مقاصد کا اضافہ ہوتا گیا۔

کانفرنس کے اجلاس ہر سال دسمبر کے آخر ہفتہ میں مختلف شہروں میں ہوتے رہے اور تھوڑے عرصہ میں اس انجمن نے وہ وقعت و منزلت حاصل کرلی کہ عام طور پر اس کو مسلمانوں کی سب سے بڑی نمایندہ جماعت قرار دیا جاتا تھا۔ اطراف ہند میں تعلیمی بیداری پیدا ہوگئی اور ساتھہ ہی ساتھہ جابجا کانفرنس کی شاخیں قایم ہونے لگیں۔ سرسید کے آخر زمانہ میں کانفرنس کا کام کسی قدر معرض تعویق میں

پڑگیا تھا لیکن اِن کے بعد نواب محسن الملک مرحوم اور پھر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی مساعی جمیلہ نے کانفرنس کو اس حد تک کامیاب بنادیا کہ بلاشبہہ وہ اپنے اولین فرض یعنی تعلیمی بیداری پیدا کرنے میں بوجہ احسن عہدہ برآ ہو گئی اور آج ایک شاندار عمارت اور مستقل سرمایہ آمدنی کی مالک ہے۔ ایک مفید ماہوار رسالہ دفتر کانفرنس سے شایع ہوتا ہے۔ اور مستقل تنخواہ دار عملہ و باضابطہ دفتر موجود ہے۔

باب پنجم

خدمات کونسل، ملکی خدمات، وفات

پبلک خدمات | ملک و قوم کی خدمت کا ولولہ سید کو چین سے بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ وہ جس طرح ابتدائی ملازمت کے زمانہ میں اصلاح و ترقی کے کاموں میں دلچسپی لیتے تھے اسی طرح باوجود کالج کے کاموں میں غیر معمولی انہماک و مصروفیت کے عام پبلک خدمات کے لئے برابر مستعد و سرگرم رہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کے بڑے کارناموں کا اصلی محور ترقی تعلیم ہی تھا۔ لیکن اُن کی عام پبلک خدمات جن کا سلسلہ زمانہ

ملازمت سے جاری تہا۔ بدستور جاری رہیں۔ چنانچہ جب ۱۸۷۸ء میں
لارڈ لٹن نے اُن کو امپریل کونسل کا ممبر بنایا تو باوجود مصروفیت
انہوں نے اس فرض کو بھی نہایت محنت و جانفشانی سے انجام دیا
اور چونکہ انگریزی زبان سے واقفیت نہیں رکھتے تھے اس لئے
ممبری کونسل کے فرائض کی ادائگی میں اُن کے لئے غیر معمولی
دشواریوں کا سامنا تھا لیکن اُن کی ہمت وسعی نے اُن کی خدمات
کونسل کو اس حد تک مشکور کیا کہ اس زمانہ کے ہندوستانی ممبران
میں بہت کم ایسے ممبر بتائے جا سکتے ہیں جن کا زمانہ ممبری اس قدر
کامیاب خیال کیا جاتا ہو۔

کونسل کا کام سرسید اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن تمام
انگریزی کاغذات متعلق کونسل کو سنتے تھے اور کافی غور و خوض کے بعد
تمام مسائل کے متعلق رائے قائم کرتے تھے اکثر تقریریں وہ اردو میں
لکھ کر ترجمہ کرا لیتے تھے اور یہ تحریر کونسل سکریٹری پڑھ کر سنا دیتا تھا
لیکن بعض مرتبہ وہ انگریزی تقریروں کو اپنے ہاتھ سے اردو خط میں
لکھ لیتے تھے اور خود ہی کونسل میں پڑھتے تھے۔ جن لوگوں نے
ان تقریروں کو سرسید کی زبان سے سنا ہے وہ ان کی خوبی اور
لطف ادا و صحت الفاظ اور پُر زور و با اثر ہونے کے نہایت مداح ہیں

بہت کم ایسے سننے والے تھے جو یہ تمیز کر سکتے کہ واقعی سرسید انگریزی زبان سے واقف نہیں۔

سرسید نے اپنے زمانہ ممبری میں دو جدید قانون خود پیش کئے اور کونسل سے منظور کرائے یعنی قانون ٹیکہ چیچک اور قانون تقرر قاضیان اس کے علاوہ ایک مسودہ انہوں نے قانون وقف علی الاولاد کا بھی طیار کیا تھا۔ لیکن بعض دشواریوں سے اس کے پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

قانون وقف علی الاولاد | وقف علی الاولاد اسلامی مسئلہ ہے لیکن اس کا ایک عرصہ سے ہندوستان میں وجود نہیں غالباً اسی سبب سے بعض علمائے اسلام نے سرسید کے زمانہ میں اس مسئلہ کے وجود ہی سے انکار کیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمانہ گذشتہ میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت ایسی نہ تھی کہ اُن کی جائدادیں اور املاک وقف علی الاولاد کا سہارا تلاش کرتیں اسی لئے لوگ اس مسئلہ کو بھولے بیٹھے تھے لیکن اب جب انقلاب حکومت نے مسلمانوں کی اقتصادی حالت دگرگوں کر دی تو ضرورت ہوئی کہ جو کچھ جائدادیں اب مسلمان خاندانوں میں باقی ہیں وہ محفوظ ہو جائیں اور ناعاقبت اندیشی و اسراف کی دست بردسے بچ سکیں۔ سرسید کو

اس مسودہ کی تیاری میں بڑی زحمت اُٹھانا پڑی اور جب مرتب ہو گیا
تو اُنھوں نے اسکو اظہار اے کے لئے عام طور پر شایع کر دیا
لیکن کونسل کے ممبروں سے امید نہ تھی کہ وہ اس کی موافقت
کریں گے بالآخر اس مسودہ کو پیش کرنے کا قصد ملتوی کرنا پڑا
لیکن اب وقف علی الاولاد کا مسئلہ فقہی کتابوں سے گزر کر
حکومت ہند کے قوانین میں داخل ہے جو بعد کو مولانا شبلی مرحوم کی
مخلصانہ کوششوں کی بدولت کونسل میں پیش ہو کر پاس ہو گیا۔

البرٹ بل ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک عنوان البرٹ بل
کے نام سے بھی نظر آتا ہے جو اُس دور کا جبکہ سر سید ممبر کونسل تھے
اور ہندوستان سیاسی تحریکوں سے پوری طور پر آگاہ بھی نہ تھا
ایک مشہور واقعہ ہے اور اگرچہ آج وہ واقعہ تازہ نہیں مگر اس کی
یاد دلانے کو اسی قسم کے واقعات جن کی بنیاد نسلی امتیاز اور پندار
حکومت ہوتی ہے اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔

لارڈ رپن کے عہد حکومت میں مسٹر البرٹ ممبر قانون امپریل
کونسل کی طرف سے ایک مسودہ قانون اس غرض سے پیش ہوا
کہ یورپین ملزمان کے مقدمات فوجداری بھی ہندوستانی مجسٹریٹوں کے
اجلاس میں پیش ہوا کریں اور اس وقت تک جو ملکی و نسلی امتیاز

محض ہندوستانی قوم کی تحقیر و اہانت کی غرض سے موجود ہے اور جزو قانون قرار دیا گیا ہے وہ ختم ہو جائے۔ اس مسودہ قانون کی مخالفت ہندوستان کے انگریز باشندوں نے اس شدومد سے کی تھی کہ مسٹر البرٹ اور بعض اعلیٰ عہدہ داران حکومت کو اپنی عزت سنبھالے رکھنا دشوار ہو گیا تھا۔ اور عام مخالفت کا کوئی مظاہرہ اس زمانہ تک اس قدر شدید دیکھنے میں نہیں آیا جیساکہ اس وقت ظہور پذیر ہوا۔

سرسید اس وقت دوبارہ ممبر کونسل منتخب ہوئے تھے۔ اُنہوں نے البرٹ بل کی حمایت میں نمایاں حصہ لیا اور اُن کی وہ تقریر جو اس موقع پر اُنہوں نے کی تھی آج تک اس قابل ہے کہ لوگ اسکے مطالعہ سے فائدہ حاصل کریں۔

اسی زمانہ میں لارڈ رپن نے بعض صوبوں کے لئے لوکل سلف گورنمنٹ کے قوانین نافذ کئے تھے جن کی رو سے ممبران لوکل بورڈ میں زیادہ تعداد منتخب شدہ ممبروں کی قرار دی گئی تھی۔ سرسید نے اس موقع پر جو تقریر کی تھی اس میں اگرچہ طریق انتخاب کی وسعت کو پسند کیا تھا، لیکن طریق نامزدگی کو قطعاً موقوف کر دینے کے خیال کو نامناسب قرار دیا تھا۔

ایجوکیشن کمیشن | ۱۸۸۲ء میں سرسید نے ایجوکیشن کمیشن میں شہادت دی جو علیگڈھ گزٹ میں شایع ہوچکی ہے اور جس کے مطالعہ مسئلہ تعلیم پر اُن کی واقفیت اور ژرف نگاہی کا ثبوت ملتا ہے

پبلک سروس کمیشن | ۱۸۸۷ء میں سول سروس کمیشن بیٹھا اور سرسید کو اس کا ممبر منتخب کیا گیا۔

پیٹریاٹک ایسوسی ایشن | اسی زمانہ میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی اور اس کا دائرہ عمل رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا۔ بعض مسلمانوں نے بھی اس میں شرکت کر لی۔ سرسید کو کانگریس کے اصولوں سے اگرچہ اختلاف نہ تھا لیکن اُن کے نزدیک سیاسی تحریک کے لئے ملک اس وقت تیار نہ تھا اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے کسی قسم کی سیاسی تحریک میں شرکت اُن کے نزدیک خودکشی کی مرادف تھی۔ چنانچہ کانگریس کی مخالفت انہوں نے شروع کی اور اسی مقصد سے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن علیگڈھ میں قایم ہوئی۔ لیکن اس کا اثر دور و نزدیک پہنچتا جاتا تھا اور اطراف ملک میں ہر جگہ مسلمانوں نے ایسوسی ایشن کی شاخیں قایم کیں اور اس کے مقاصد سے اتفاق کیا۔

کے سی ایس آئی | ۱۸۸۸ء میں سرسید کو جدید خطاب و اعزاز

کے، سی۔ایس۔آئی۔نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلی ستارہ ہند ملا اور جب ہی سے سید احمد خان سر سید کہلائے۔

ال۔ال ڈی۔ | ۱۸۸۹ء میں سر سید کو اڈنبرا یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لاز کی آنریری ڈگری عنایت کی۔جو اُن کی خدمات تعلیمی و مرتبہ تصنیف و تالیف کے شایان شان ہونے کے علاوہ ایک غیر ملک سے آنے کی وجہ سے اور زیادہ قابل فخر ہے۔

معاملات کالج | سر سید کو باوجود اپنی عام خدمات کی جو مصروفیت معاملات کالج میں تھی اس کا صحیح اندازہ کسی قدر دشوار ہے کالج کی ترقی کے ساتھ ساتھ اُوسکے کاموں کی کثرت ہی ہوتی جاتی تھی اور سر سید کا زیادہ وقت تعمیرات کے اہتمام، دفتر کی دیکھ بھال حصول چندہ کی تدابیر میں گزرتا تھا۔چنانچہ جس قلیل عرصہ میں انہوں نے گمنام علیگڈھ کو تمام ہندوستان میں مشہور و ممتاز بنادیا وہ بجائے خود حیرت انگیز کارنامہ ہے۔اور اگرچہ ان تمام کارناموں کی زیادہ تر ذمہ داری انہیں کی ذات پر تھی لیکن وہ کالج کے متعلق جملہ امور مشورہ اور آئین کے اصول پر کرتے تھے چنانچہ کالج کا سرمایہ اور اس کا نظم و نسق مجلس امنا ریا ٹرسٹیان کے سپرد تھا اور اس جماعت کی باقاعدہ رجسٹری ہوگئی تھی لیکن سر سید کو بحیثیت سکریٹری تمام کاروبار

خود ہی کرنا پڑتا تھا اور جو کام اِن کے فرائض منصبی میں نہ ہوتا اس کی وہ مجلس امناء سے اجازت حاصل کر لیتے تھے۔ اس طرح اکثر کاموں میں اُن سے اور بعض دوسری قومی کام کرنے والوں اور کالج سے دلچسپی رکھنے والے ٹرسٹیوں سے شدید اختلاف رائے ہو گیا اور اس اختلاف نے آخر آخر بدمزگی کی ایسی صورت اختیار کر لی جو اگرچہ سر سید کے لئے ذاتی طور پر نہایت رنج و افسوس کا باعث تھی لیکن قومی اور جماعتی کاموں میں اختلاف بھی ناگزیر ہے اس لئے وہ اس درجہ ملول و شکستہ دل نہ ہوتے تھے کہ کالج کے کام سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ لیکن ۱۸۹۵ء میں جو صدمہ اُن کو اُٹھانا پڑا اس نے اُن کو آخر وقت تک سنبھلنے نہ دیا۔

کالج میں غبن سر سید نے کالج کا تمام سرمایہ الہ آباد بنک کی معرفت جمع کر دیا تھا اور اس سرمایہ کی تعداد ۶۳ ہزار تک پہنچ گئی تھی دفتر کا ہیڈ کلرک جو سر سید کی نظروں میں نہایت قابل اعتماد شخص تھا۔ اپنے ہاتھ سے چک لکھکر اُن کے سامنے پیش کرتا اور ان سے دستخط لے کر اُس کو جاری کرتا تھا۔ سر سید کو اس شخص پر ہمیشہ اعتماد رہا اسی لئے انہوں نے کبھی چک بک سے آمد و خرچ کا مقابلہ نہ کیا اور اُس نے سر سید کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ایک لاکھ سے

زیادہ کی رقم بنک سے نکال لی اور اپنے صرف میں لے آیا۔ اس واقعہ نے سرسید پر اس قدر سخت اثر کیا کہ ان کی زندگی سے مایوسی اور کالج کی روز افزوں ترقی میں سخت رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ بایں ہمہ وہ کالج کے کاموں میں اسی شغف اور انہماک سے بدستور مشغول رہے اور اس شدید نقصان کی تلافی کی فکریں کرتے رہے۔ لیکن کالج کی مالی حالت کچھ سنبھلنے نہ پائی تھی کہ ان کو ایک اور شدید صدمہ پیش آیا اور وہ سید محمود مرحوم کا دماغی مرض تھا جس کی تکلیف اور اذیت نے اُن کے لئے لطف زندگی ختم کر دیا اور وہ ہمہ وقت خاموش اور متفکر رہنے لگے۔

وفات

بالآخر ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کو حبس بول کا عارضہ لاحق ہوا اور کچھ دنوں کی علالت کے بعد انہوں نے وفات پائی۔ کالج کے میدان میں نماز جنازہ ادا کی گئی ہزارہا آدمیوں کا مجمع تھا۔ ہر مذہب و قوم کے لوگ اور ضلع علی گڈھ کے تمام عمائدین و روسا اور حکام گورنمنٹ شریک جنازہ تھے مسجد علیگڈھ کالج میں دفن کئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

عفی عنہ

۱۳۱۵

ہجری

باب ششم

مذہبی خدمات

مذہبی تعلق

سرسید نے آغوش مادر میں آنکھ کھولی تو مذہبی اثرات اپنے گردو پیش دیکھے گھر میں نماز روزہ، کلمہ کلام سنا اور گھر سے باہر بزرگوں کی صورت اور خانقاہوں کی عمارت نظر آئی بچپن میں قدم رکھا تو مولانا غلام علی شاہ کی اشارہ سے بسم اللہ پڑھی اور اس وقت سے برابر مذہب اسلام کے احکام و اعمال دیکھنے اور سننے کا موقع ملتا رہا۔ اُن کے خاندان کو بزرگان دین سے جو عقیدت اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے جو نسبت خاص تھی اس کا اثر تھا کہ سرسید کے مذہبی خیالات بچپن میں بھی توہم پرستی کی طرف مائل نہ تھے۔

زمانہ طالب علمی کے بعد دنیا میں قدم رکھتے ہی اُنھوں نے مذہبی دلچسپی کا ثبوت بعض رسائل کی تصنیف سے دیا ہے اور جس قدر عمر و تجربہ اور ذوق تصنیف بڑھتا گیا مذہبی تفحص اور اجتہادی رنگ بھی

ترقی کرتا رہا۔ سفر انگلستان سے قبل جو مذہبی رسالے اُن کی قلم سے نکلے وہ اُنہیں مباحث سے متعلق ہیں جو اس زمانہ کے مسلمانوں کو اپنی جانب متوجہ رکھتے تھے جس میں تصوف، سنت و بدعت وسیرۃ کو امتیازی حیثیت حاصل تھی لیکن ہنگامہ غدر کے انقلابات اور سلطنت مغلیہ کے زوال نے جب نئے مسائل کو نمایاں اور جدید ضروریات کو ظاہر کیا تو سر سید نے بھی مذہبی خدمت کی جدید راہ اختیار کی۔

اسلامی حکومت کا خاتمہ ہندوستان میں ہیئت اجتماعی کی تاسیس اسلامی حکومت کے زیر سایہ ہوئی تھی اور شیرازۂ اسلامی کی پشت و پناہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت تھی۔ جب آفتاب اقبال غروب ہوا اور رفتہ رفتہ نظام سلطنت فنا ہو کر انگریزی حکومت کا تسلط قایم ہو گیا تو مسلمانوں کا عام انتشار و پراگندگی نے بھی اُن کی بد اقبالی کے ساتھ ظہور کیا۔ چنانچہ تمدن و معاشرت کے ساتھ مذہب و اخلاق بھی خطرہ میں آگیا۔

انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ اُن کی تجارت اور اُن کا مذہب بھی اس ملک میں آیا تھا اور ایک عرصہ دراز سے عیسوی مذہب کی تبلیغ مشنریوں کے ذریعہ سے اس ملک میں جاری تھی۔ لیکن اِن کوششوں کا اثر اگرچہ ہندوستانیوں سے پوشیدہ نہ تھا

لیکن وہ اُس کے حقیقی نقصان سے اس لئے کماحقہ آگاہ نہ تھے کہ جو تدابیر مشنری مبلغین اختیار کر رہے تھے وہ عام ہندوستانیوں کی نگاہ سے کسی قدر اوجھل تھیں اور وہ اُن کی تہہ تک بہ آسانی نہیں پہنچ سکتے تھے۔

خود ہندوستانی سوسائٹی میں مسلمانوں نے مذہب کی اک خاص حیثیت قرار دے لے تھی صدیوں کی اسلامی حکومت نے احکام اسلامی کے ساتھ اسلامی تمدن و معاشرت کو کچھ اس طرح وابستہ کر دیا تھا کہ ایک دوسرے میں امتیاز دشوار تھا۔ رسم و رواج کی پابندی اور ہندوستانی آب و ہوا کے اثر سے قدامت پسندی نے طبیعتوں میں گھر کر لیا تھا چنانچہ جن جزوی مسائل مذہبی کو قبول عام کی سند حاصل ہو چکی تھی اگر اُن کے خلاف کسی قسم کی صحیح تجویز بھی پیش کیجاے تو وہ گویا اسلام سے روگردانی اور مذہب سے بے اعتنائی کی مرادف قرار دی جاتی تھی۔

مذہبی اثر — نیز صدیوں کی اسلامی حکومت نے عام مسلمانوں کو اس امر کا عادی کر دیا تھا کہ ہر مسئلہ کو خواہ اس کا تعلق اصلاح معیشت سے ہو یا تمدنی و اقتصادی حالت سے، خواہ ملکی و سیاسی حیثیت سے، وہ مذہبی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اور اگر ان کے نزدیک وہ مذہبی

معیار پر صحیح نہیں اُترتا تھا تو کمال شد و مد سے اس کے قائل و حامی کو دائرہ اسلام سے خارج تصور کرنے کا فتویٰ صادر کر دیتے تھے۔ سر سید اصلاح قومی کے لئے متعدد کاموں میں مشغول تھے اور تقریباً ہر کام ہندوستانی مسلمانوں کے زاویہ نگاہ سے نیا اور مذہبی اصطلاح کے اعتبار سے بدعت تھا اس لئے اُن کے کاموں کی مذہبی رنگ میں مخالفت ہونا اور زیادہ قرین قیاس تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور اسی مخالفت کی اصلاح کے لئے سر سید کو چار و ناچار مذہبی معاملات اور مسائل کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

مذہبی تعصب

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سر سید نے جس قدر مذہبی مسائل پر زور قلم اور قوت بیان صرف کی وہ سب مجبوری سے نہ تھی بلکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے اور صحیح یا غلط یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ مسلمانان ہند مذہب کے نام سے بہت سے توہمات اور بیجا تعصب کے شکار ہو رہے ہیں۔ کتنی ہی غلط فہمیاں دوسروں کی طرف سے اِن کے دلوں میں جاگزیں ہیں اور کتنی ہی غلطیاں خود مذہب کے متعلق اُن کے عمل اور معتقدات میں پیدا ہو گئی ہیں۔ ممکن تھا کہ باوجود اس اعتقاد کے وہ مذہبی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوتے لیکن دو ایسے زبردست و قوی وجوہ تھے جن کے باعث اِن کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا

اور اس کوشش میں اپنی عادت کے موافق انہوں نے اپنا وقت، روپیہ ہمت و قوت سب لگا دی۔

سر سید اچھی طرح دیکھ چکے تھے کہ زمانہ نے جو کروٹ لی ہے اس سے ہندوستان کے مسلمان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ان کی حکومت ختم ہو گئی لیکن وہ خود ابھی باقی ہیں اور اگر اُن کو فنا ہو جانا منظور نہیں ہے تو یقیناً اُن کو زمانہ کا ساتھ دینا پڑے گا۔ انگریزوں کے تسلط نے جس تہذیب کی اشاعت اور جن علوم کو رواج دیا وہ مسلمانان ہند کے لئے کیسی ہی انوکھے ہوں لیکن اُن کے مذہب کے منافی نہیں مغربی تہذیب کے اثرات اور ایشیا، اور یورپ کے تصادم سے جو جدید دروازے ترقی تجارت، تبادلہ خیالات اشاعت علوم اور آزادی مذاہب کے کھل گئے تھے اُن کی وجہ سے مسلمانان ہند کو اپنے مذہب کی حقیقت سے صحیح طور پر واقف ہونے کی اور زیادہ ضرورت تھی اور حکومت و ارباب حکومت سے اپنے حقوق حاصل کرنے کی راہ میں جو قومی تعصبات اور قدامت پسندی مانع ہوتی تھی اُن کے اور صحیح مذہبی تعلیمات کے درمیان فرق کرنے کی شدید ضرورت درپیش تھی۔۔ اسی مقصد سے سر سید نے مسلمانان ہند اور انگریزوں کے درمیان بعض بے بنیاد غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کی جن کو

غلطی سے مذہب کا نام دے کر مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں سنگ گراں قرار دیا تھا۔

علوم مغربی | دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ سر سید نے اپنی قوم کی فلاح وبہبود کا واحد ذریعہ ترقی تعلیم اور اشاعت علوم جدیدہ قرار دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ "محکوم مسلمانوں" کے لئے اپنی قومی زندگی قائم رکھنے کا اگر کوئی ذریعہ باقی ہے تو وہ محض ترقی تعلیم ہے اور اسی مقصد سے انہوں نے علیگڈھ کالج کی بنیاد رکھی اور متعدد دوسری کوششیں اس باب میں کرتے رہے، لیکن تعلیم جدید مسلمانوں کیلئے خطرہ سے خالی نہ تھی۔

مغربی علوم جدیدہ کی دو خصوصیات قابل لحاظ ہیں۔ اول یہ کہ اس طریق تعلیم میں روحانیت یا مذہبیت کا نام نہیں۔ چنانچہ جو نصاب تعلیم موجودہ یونیورسٹیوں، کالجوں، اور اسکولوں میں مروج ہے نیز ہندوستان سے باہر مغربی ممالک میں جہاں موجودہ ترقی علوم واصلاح طریق تعلیم وجود میں آئی ہے۔ اس کو اول سے آخر تک ملاحظہ فرمایئے مذہبی اثر اور روحانیت (جسکے محدود معنے خالق وخلق کا تخیل حیات فانی اور مذہب ومعاد سمجھنے چاہئیں) کے ذکر سے وہ قطعاً بے نیاز ہے تعلیم کا نظام تقسیم فنون کے ماتحت ہے اور

ہر علم و فن کی تحقیق و تدوین محض علمی نقطہ نظر سے کی گئی ہے۔
اخلاق کی کتابوں کو فسانہ و ادب کی رنگینی سے پرکیف بنانے کی
کوئی کوشش نہیں کی جاتی اور نہ جغرافی حالات کو ذاتی و شخصی تذکرے سے
خواہ مخواہ دلچسپ بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح فن منطق و فلسفہ کو مذہبی
حقائق و تناقص کی بحثوں سے آلودہ نہیں کیا جاتا اور نہ ادب و شعر کو
اخلاقی قصص مذہبی تمثیلات اور پند و حکمت سے پراگندہ کیا جاتا ہے
بچوں کے لئے جو ابتدائی درسی کتابیں مروج ہیں وہ بھی خدا و رسول
یا مذہب و اخلاق سے نہیں بلکہ کسی دوسرے ہی عنوان سے شروع
ہوتی ہیں بادی النظر میں یہ اعتراض سطحی معلوم ہوتا ہے لیکن بہ اعتبار
فنِ تعلیم مذہب سے یہ بے اعتنائی آغاز تعلیم میں مہلک اور ثانوی
و اعلیٰ تعلیم کے مدارج میں بھی کسی طرح مفید نہیں قرار دی جاسکتی اور
نہ یہ طریق تعلیم اُن مقاصد کو پورا کرسکتا ہے جس کے لئے تعلیم وضع کی گئی ہے
یہ اعتراض جس طرح سرسید کے زمانہ میں موجودہ طرز تعلیم پر وارد
ہوتا تھا آج اُس سے زیادہ صحیح ہے اور موجودہ رہنمایان تعلیم بھی
با وجود آزادی فکر کے گاڈلیس ایجوکیشن (GODLESS EDUCATION)
یا اس تعلیم کے جس میں خدا اور مذہب کا نام نہ ہو قائل نہیں ہو سکتے
دوسری خصوصیت تعلیم جدید کی اُسکے اثر اور نتائج کے اعتبار سے ہے

جس میں امور متذکرہ بالا کے علاوہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی، جدید جدید علوم و فنون کے وجود اور مغربی ترقی و تہذیب کی جلوہ گری کو بہت کچھ دخل ہے۔

عربی مدارس میں جو نصاب تعلیم درس نظامی کے نام سے مشہور ہے وہ ہندوستان اور اکثر ممالک اسلامی میں سیکڑوں برس سے بدستور چلا آتا ہے اور قدیم طریقہ تعلیم کی یہ ہی کائنات ہے اس نصاب کی خوبی سے انکار نہیں لیکن اس کا مقصد وہ نہیں ہے جو عام طور پر ہندوستان میں قرار دے لیا گیا ہے یعنی اس کا مقصد طلبہ کو فارغ التحصیل بنانا نہیں بلکہ تحقیق علمی اور کسی فن میں کمال حاصل کرنے کا اک ذریعہ فراہم کرنا ہے۔ اسکی مثال بلاتشبیہ ایسی ہے جیسے ہماری یونیورسٹیوں کے گریجویٹ ہیں کہ ان کی ڈگری ان کو اس منزل پر پہنچا دیتی ہے جہاں سے اگر وہ چاہیں تو کسی ایک فن کی تکمیل اور مہارت حاصل کر سکتے ہیں اور ڈاکٹریٹ یا حکمت کا درجہ اس خاص فن میں حاصل کرنیکی صلاحیت اُن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جو طلبہ محض درس نظامی کی تکمیل کو اپنی علمیت کا مدار سمجھے ہوئے ہیں وہ بالعموم اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جس علم و فن کے متعلق وہ گفتگو کرتے ہیں اس میں

انہیں دلائل سے کام لیتے ہیں جو نظام الملک طوسی کے زمانہ میں رائج اور ضروری تھیں اور اُس وقت سے اب تک جو جدید تحقیقات اور انکشافات ہوئے ہیں اُن سے وہ اسی قدر ناآشنا ہیں جس قدر کہ اس دنیا والے کرۂ مریخ کے باشندوں سے۔ جب تک حکومت اسلامی کا عروج رہا اس خامی کی تلافی بھی بوجہ احسن ہوتی رہی۔ مہمات سلطنت اور جلیل القدر مناصب واہم خدمات کی ذمہ داری اُن میں بصیرت قوت فیصلہ اور اخذ نتائج کی وہ قوتیں پیدا کردیتی تھی جو اُن کے بیشمار اور حیرت انگیز کارناموں سے ظاہر ہے۔ لیکن اس زمانہ میں یہ مواقع باقی نہ تھے اور جو حملہ جدید علوم و سائنس و انکشافات نے اُن کی فرسودہ منطق و حکمت پر شروع کیا اس کے جواب کے لئے اُن کے پاس کوئی کارگر آلہ نہ تھا۔ اس کمزوری کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مذہب اسلام کی حفاظت کا سوال پیدا ہو گیا اور جس مستحکم قلعہ کو دنیا اب تک ناقابل تسخیر سمجھتی تھی، وہ ہر چہار طرف سے دشمنوں کے حملے سے گھر گیا۔

انیسویں صدی | اِن حالات میں انیسوی صدی کا وہ دور شروع ہوا جو ہندوستان ہی نہیں تمام روے زمین کے لئے جدید انقلابات کا پیش خیمہ قرار پایا سائنس اور علوم طبعی نے قدیم حکمت و فلسفہ کی

مستحکم دیواریں گرا دیں، ہیئت وفلکیات نے تقویم پارینہ کو حرف غلط کی
طرح مٹا دیا جدید اکتشافات وعلمی ترقی نے اک نئی دنیا پیدا کر دی
اس ہی زمانہ میں جدید ایجادوں نے انسان کو وہ قوت عطا کی کہ
اب وہ اپنے دست بازو سے دنیا کی شہنشاہیت کا دعوی کرنے لگا۔
زمین کے اندرونی خزانے اس نے حاصل کر لئے، سطح آب کو اپنے لئے
بے خطر بنا لیا۔ آسمان تک رسائی کے خواب دیکھنے لگا اور تھوڑی
مدت میں وہ سب کچھ ہونے لگا جو اب تک محال عادی بلکہ محال عقلی تھا۔
ذرائع رسل ورسائل، چھاپہ کی ایجاد، تجارت کی ترقی، اور
آمد ورفت کی سہولت نے ان انقلابات کو نہایت قلیل عرصہ میں
تمام عالم سے روشناس کرا دیا اور ہر جدید چیز بیشمار نئے مسائل
اپنے ساتھ لیتی آئی قدیم فلسفہ کے پڑھنے والوں کے لئے یہ مشکل
ہوگیا کہ وہ زمین کو ساکت سمجھیں جب کہ مغربی حکما ناقابل انکار دلائل
اور جدید آلات سے اس کی حرکت وگردش ثابت کر رہے تھے
علم جغرافیہ کی صحت اس لئے مشتبہ ہوگئی کہ ہفت اقلیم کی کوئی سند
موجودہ تجربہ ذاتی سے نہیں ملتی تھی اور نہ اُن ممالک کا ذکر تھا جن میں سے
بعض کو مغربی سیاحوں نے خود دیکھا اور دنیا کو دکھلایا۔ لیکن جب
یہ اثرات مذہب تک پہنچے تو اُن کا دائرہ زیادہ وسیع اور اُس کی

ضرب کہیں زیادہ کاری تھی اول تو جدید فلسفہ و سائنس کی بنا پر مذہبی
دلائل کوئی وقعت نہیں رکھتے تھے دوسرے حالات میں احکام مذہبی کا
جدید حالات کا ساتھ دینا تقریباً ناممکن ہوگیا اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں
حلال و حرام کی بحث لازمی ہوگئی، تجارت نے دنیا کی چیزوں کو
جس طرح عام کردیا اور مختلف ممالک کو ایک منڈی بنا دیا نیز
اجناس و اشیاء کو جن بیشمار مختلف صورتوں میں پیش کیا وہ بالعموم
مفتیان اسلام کے لئے نئی تھیں اور ان بزرگوں کو ان حالات سے
اس قسم کی بے تعلقی تھی کہ انہوں نے کبھی اُن سے واقفیت حاصل
کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اسی وجہ سے موجودہ حالات پر اصول
اسلام کو منطبق کرکے شرعی صورت کا استخراج بھی نہو سکا اور ایک عام
انتشار و اختلال کی کیفیت پیدا ہوگئی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب
اسلام کے مخالفین کو اُس پر اعتراضات اور حملوں کا اک نادر موقعہ
ہاتھ آگیا اور اس سے انہوں نے نہایت مستعدی سے فائدہ اُٹھایا
چونکہ علماء مغرب علاوہ جدید طرز استدلال اور علوم طبعی و فلسفہ
و حکمت کے صاحب ثروت اور مالک حکومت بھی تھے اس لئے
ان کی طرف سے جو اعتراض ہوتا تھا وہ کہیں زیادہ وسیع اور اپنے
مضر اثرات کے اعتبار سے نہایت کامیاب ہوتا تھا چنانچہ مشنری

مبلغین نے زبان وقلم سے کام لینے کے علاوہ حکومت کی اعانت اور تجارت کی حمایت سے بھی فائدہ اُٹھایا اور صرف مذہب اسلام پر اعتراضات ہی نہیں کئے بلکہ ہزاروں مسلمانوں کو اُن کے دین حق سے منحرف کر کے عیسائی بنا لیا۔

فتنۂ ارتداد | سرسید ان حالات سے بے خبر نہ تھے بلکہ بعض جگر دوز واقعات خود اُن پر گزر چکے تھے اُن کے زمانہ قیام مرادآباد میں جب انتظامات قحط کے سلسلہ میں ایک یتیم خانہ کھولا گیا تو وہ خود اسکے مہتمم تھے اور جس شفقت و دلسوزی سے انھوں نے یتیموں کی خدمت کی اور بغیر امتیاز مذہب وملت ان کی دلجوئی اور ہمدردی کرتے رہے اُن کو بحالت بیماری خود اپنے ہاتوں سے اُٹھاتے اُن کے کثیف او غلیظ کپڑے بدلتے اون کے منہ ہاتھ دھوتے لیکن جب قحط کا کام ختم ہوا اور یتیم خانہ بند کیا گیا تو جس قدر لاوارث بچے اوس وقت موجود تھے وہ عیسائی مشنریوں کو دیدیے گئے حالانکہ سرسید نے نہایت شد و مد سے مخالفت کی اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندو بچے ہندوؤں کو اور مسلمان مسلمانوں کو دیدیے جائیں اور اُن سے اقرارنامہ لکھا لیا جائے کہ وہ اُن کو غلام اور کنیز نہ بنائیں گے اور اُن کے آرام و آسائش کے کفیل ہوں گے۔

لیکن یہ خطرہ عام لوگوں اور جاہلوں میں ایسا شدید نہ تھا جیسا کہ تعلیم یافتہ جماعت اور جدید علوم کے طلبہ میں نظر آتا تھا مغربی تعلیم اور تہذیب و تمدن نے مذہب پر جو کاری ضرب لگائی تھی اس سے یہی طبقہ زیادہ متاثر ہوتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ تعلیم یافتہ جماعت کا گمراہ ہو جانا قوم کے لئے سب سے بڑی مصیبت تھی

علم الکلام جدید علوم و فنون سے جو شبہات مذہب کے متعلق پیدا ہوتے تھے وہ خاص مسائل تک محدود نہ تھے اور نہ یہ صورت تھی کہ بعض اکتشافات یا ایجادوں نے چند مسائل کی صورت بدل دی ہو۔ بلکہ فی الحقیقت سائنس اور علوم جدیدہ کا اثر اس قدر وسیع و عالمگیر تھا کہ اس نے دنیائے خیال میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اور مذہب جسکی بنیاد اعتقاد پر ہے۔ وہ بھی بادی النظر میں اپنے قدیم اصولوں سے ہٹتا نظر آتا تھا۔ اس قسم کے دو خطرے اس سے قبل رونما ہو چکے تھے اور اسلام نے اُن کے استعمال کے لئے نئے ہتھیار وضع کئے تھے، سب سے اول فتنہ اعتزال تھا جس نے معتقدان اسلام کے متعلق عقلی دلائل سے کام لیکر شبہات و خدشات کا دروازہ کھول دیا اور متعارف و مسلم اصولوں کو متزلزل کر دیا لیکن جب عہد عباسیہ میں یونانی فلسفہ و حکمت نے عروج پایا اور اعتزال نے دوسرا رنگ اختیار کیا تو اسکا تدارک

اِن تدابیروں سے ناممکن ہوگیا۔ جو اس سے قبل آخر زمانہ خلافت میں اختیار کی گئی تھیں بلکہ ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی گئی اور جن ہتھیاروں کو اسلام کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا اُن کے مقابلے کے لئے بھی اسی قسم کے آلات وضع کئے گئے۔ چنانچہ احکام قرآنی اور مسائل اسلامی سے متعلق تاویل اور نقل وعقل کی مطابقت کا رواج تاریخ اسلام میں کوئی نئی چیز نہ تھا بلکہ ضرورت کے وقت علمار اسلام نے ہمیشہ اسی طرف رجوع کیا اور اسلام کو اس ذریعہ سے اِن خطرات سے محفوظ کیا جو نقل وعقل کے تناقض سے بارہا پیش آتے رہے ہیں سرسید نے بھی اسی ذریعہ سے اُن شکوک اور خطرات کا مقابلہ کیا جو جدید تعلیم یافتہ گروہ کے دلوں میں مذہب کے خلاف پیدا ہوتے تھے۔

اجتہادی مذہب | لیکن علاوہ اس شدید واہم ضرورت اور زبردست اثر کے سرسید طبعاً اجتہاد فی المذہب کی طرف مائل تھے اور اُن کی تعلیم وتربیت جس نہج پر ہوئی تھی اس کا لازمی اقتضار تھا کہ وہ شرک وبدعت سے متنفر، توہمات ورسم رواج کی پابندیوں سے علیحدہ ہوکر مذہب کو تقلیداً نہیں بلکہ کامل غور وفکر کے بعد اعتقاداً قبول کریں اور اس کی سختی سے قایم رہیں۔ ان کا خاندان اوہام پرستی سے ہمیشہ محترز رہا اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے جانشینوں اور شاہ غلام علی صاحب کی

فیض تربیت کا یہ اثر ہوا کہ اُن کے یہاں خلاف شرع مراسم نے رواج نہ پایا۔ اسکے بعد مولانا محمد اسمعیل صاحب شہید کی تصانیف کا اُن پر گہرا اثر ہوا۔ لیکن جب زمانہ غدر کی مصیبتوں کے بعد اُنہوں نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان بہتر تعلقات پیدا کرنے کی سعی کی تو ان کو معلوم ہوا کہ اختلافات اور کشیدگی کی بنا زیادہ تر مذہبی تعصبات ہیں چنانچہ اس نظر سے انہوں نے مذہب اسلام کا از سر نو مطالعہ شروع کیا اور اس زمانہ میں اُن پر تحقیق و تدقیق نے بہت سے ایسے حقائق واضح کئے جو اُس وقت عام مسلمانوں کی نظر سے محو ہو چکے تھے ایک ہزار برس کی مسلسل حکومت نے مسلمانوں کے دل سے مذہب اسلام کی مخالفت کا خطرہ دل سے مٹا دیا تھا اور اُن کے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی وہ وقت بھی آئے گا کہ دین اسلام ہر چہار طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں گھر جائے گا۔ وہ مذہبی احکام کے لئے علمائے اسلام کی کتابوں سے رجوع کرتے تھے اور انہی کو اپنی زندگی کا روزنامچہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ قرآن و حدیث کا تنقیدی نظر سے مطالعہ بالکل موقوف ہو چکا تھا اور بجز استناد یا تلاوت کے ان مقدس کتابوں سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔

تقلید سے انکار | سید نے شخصی تقلید کو جو موجودہ حالات کا حقیقی سبب تھا

بالکل پس پشت ڈال دیا اور اپنے مذہبی کاموں کی بنیاد محض قرآن وحدیث پر رکھی۔ حدیث میں بھی وہ محض روایت کے پابند نہ تھے بلکہ درایت کو بھی لازمی سمجھتے تھے۔ چنانچہ سب سے بڑی مذہبی خدمت جو آخر زمانہ میں اُن کے ہاتھ سے انجام پائی وہ تقلید سے اجتناب اور معاملات مذہبی میں غور وفکر کی بنیاد قایم کرنا ہے۔ انہوں نے صدیوں کی زنجیروں کو جس جرأت کے ساتھ توڑا ہے وہ مذہبی آزادی کی تاریخ میں قابل ذکر واقعہ ہے۔

ابتدائی دور ۔ ابتدائی رسائل کے علاوہ مذہبی خدمات کے سلسلہ میں سرسید کی پہلی کوشش ان تعصبات کو دور کرنا تھا جو مسلمان اپنے عیسائی حکمرانوں سے رکھتے تھے اور اس سلسلہ کی پہلی کڑی انجیل کی تفسیر ہے جس کو انہوں نے غازی پور کے زمانہ قیام میں لکھنا شروع کیا جو تبیین الکلام کے نام سے شائع ہوئی لیکن یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی اور نہ غالباً اس کا وہ اثر ہوا جس کی توقع کی جاتی تھی۔ اسی سلسلہ میں وہ بہت سے رسائل اور مضامین ہیں جو سرسید نے انگریزی طرز معاشرت کی حمایت اور عیسائیوں کے ساتھ کھانے پینے اور اُن کے ذبیحہ یا منخنقہ طیور کے جائز وحلال ہونے کے بارہ میں لکھے ان تمام رسائل میں گو سرسید بہ اعتبار واقعہ کے

جمہور مسلمانان ہند سے اختلاف رکھتے تھے لیکن اِن میں کوئی مسئلہ بھی ایسا نہ تھا جس کو اکابر علماء اسلام تسلیم نہ کرتے ہوں اور اُس زمانہ میں اُس سے اختلاف محض مذہبی نہیں بلکہ زیادہ تر رسوم ورواج کی بنا پر اور تقلید شخصی کے اثر سے ہوا ہو۔ یہ ہی سبب ہے کہ گو اِن مسائل نے اُس وقت سرسید کو کافر و ملحد ٹھہرایا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُن پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہو گیا اور اب اِن کو اختلافی مسائل میں شمار ہی نہیں کیا جاتا۔

سرسید کی اِن کوششوں کا مقصد زیادہ تر اصلاح تھی جو وہ مسلمانوں کی تمدنی و سیاسی حالت میں دیکھنا چاہتے تھے اور اِن مسائل کا تعلق بھی سیاسیات و تمدن و معاشرت ہی سے تھا اور اس کو حقیقی مذہبی خدمت قرار نہیں دیا جا سکتا تھا

غیر مذاہب کا مقابلہ | لیکن اس کے بعد اُن کے مذہبی خدمات کی دو بڑی تقسیم کی جا سکتی ہیں اول وہ خدمت جو اُنھوں نے معترضین اسلام کے جواب دینے میں کی اور اس طرح یورپ کے حملوں کا استیصال کیا۔ دوسری وہ خدمت جو انھوں نے مذہب اسلام کو دین فطرت قرار دے کر اس میں سائنس و علوم جدیدہ کے ساتھ تطبیق دکھائی، اور اس طرح عارضِ جدیدہ کے مخفی خطرات سے اس کو محفوظ کیا

سر سید نے مشنری واعظوں کے مباحثے اور اعتراضات بارہا سنے تھے لیکن اونکو یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ انگریز مصنف جب مذہب اسلام کی مخالفت پر اُٹھتے ہیں تو کیسے کیسے ہتھیار اسکو خلاف استعمال کرتے ہیں۔ جب پہلی مرتبہ اُنھوں نے سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد دیکھی اور اُن کو معلوم ہوا کہ میور نے خود اسلامی کتابوں اور مسلمان علمار کے اقوال و دلائل کو کس خوبی سے مذہب اسلام کے خلاف استعمال کیا ہے تو اُن کی آنکھیں کھلیں اور اُن کو محسوس ہوا کہ اس مخالفت کا سدباب محض الزامی جوابات یا مسائل اسلامی کی نقل کر دینے سے ممکن نہیں۔ بلکہ ضرورت ہے کہ جس علمی تحقیق اور تنقیدی نظر سے مسائل اسلامی اور واقعات تاریخی کو اسلام کے خلاف استعمال کیا گیا ہے اُسی پیرایہ میں حقیقت اسلام واضح کی جاے اور جن بیجا اعتراضات سے معترضین نے اسلام کو بدنام کرنا چاہا ہے وہ ایک ایک کرکے اُٹھا دئے جائیں یہ کام زمانہ حال کے علماے اسلام کی ہمت وسعی سے انجام پانا مشکل تھا۔ اس لئے کہ مغربی علوم و مضمون سے ناواقفیت اور مسائل مذہبی کو ہمیشہ تقلیدی نظر سے دیکھنے کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ لوگ اپنے دائرہ سے باہر قدم نکالنے پر قادر ہی نہ تھے

چنانچہ سرسید نے جب میور کی کتاب کا جواب لکھنا شروع کیا تو اُن کو محسوس ہوا کہ علمائے ہندوستان اور اسلامی کتب خانے اس معاملے میں اُن کی امداد سے عاجز ہیں اور جب تک مغربی علوم اور غیر زبانوں کے علمی خزانہ سے مدد نہ لی جائے اس کتاب کا جواب مکمل نہیں ہو سکتا اسی مقصد سے انہوں نے لندن کا سفر کیا اور اپنے زمانہ قیام کا بڑا حصہ خطبات احمدیہ کے نذر کر دیا۔ چنانچہ جب خطبات احمدیہ کا انگریزی ترجمہ شائع ہو کر سر ولیم میور کے ہاتھ میں پہنچا اور اُنہوں نے اس کو دیکھا تو بیساختہ کہنا پڑا کہ "میں نے سید احمد خاں کے مذہب پر اعتراض نہیں کئے تھے بلکہ مسلمانوں کے مذہب پر مجھے اعتراض تھا۔"

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی اس ضرورت کو محسوس نہیں کیا تھا کہ اُن کو اپنی طرز استدلال میں اس قسم کی ترمیم کرنی چاہیئے کہ وہ غیر قوموں میں مقبول، اور معترضین کے لئے اُن کی دریدہ دہنی کا شافی جواب ہو سکے۔

خطبات احمدیہ میں تقریباً اُن تمام مشہور اعتراضات کے جواب دیے گئے ہیں جو بالعموم عیسائی قومیں اور یورپین مصنف مذہب اسلام پر کیا کرتے ہیں اور جن میں سب سے زیادہ مشہور یہ ہیں۔

(۱) غلامی کا رواج (۲) جہاد (۳) تعدد ازواج (۴) طلاق
(۵) نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کثرت ازواج (۶) معجزہ
(۷) معراج و شق صدر

سرسید نے اِن اعتراضات کے جواب دینے میں بڑی محنت اور کاوش کی ہے اور جو طرز بیان اختیار کیا ہے وہ یقیناً مروجہ مذہبی تحریروں سے بالکل جدا ہے اور اس نے جدید علمی تحقیقات و طرز استدلال کی بنیاد قایم کردی ہے مثلاً تعدد ازواج کی بحث میں انہوں نے علم البدن، فن طب، تاریخ قدیم کے واقعات، مذہب عیسوی کے اسناد، اقتصادی و سیاسی اغراض زمانہ حال کے حکمار کے خیالات اور خود اسلام کی تعلیم۔ غرض ہر پہلو سے بحث کی ہے اور انہیں آزاد مغربی اصولوں کی بنا پر تعدد ازواج کو جائز قرار دیا ہے جن کی بنیاد پر اعتراضات قایم کئے گئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ عدل کے احکام اس قدر سخت ہیں کہ ایک بیوی سے زیادہ گنجائش نہیں دیتے اور یہ ہی مذہب صحیح ہے،

غلامی کے متعلق اُنہوں نے جو کچھ لکھا وہ بھی اسی اصول پر لیکن یہ اعتراض ایسا تھا کہ تمام دنیا مسلمانوں کو (جنہوں نے فی الحقیقت بردہ فروشی کو خدمت و محبت سے بدل دیا تھا)

بدنام کرتی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ مذہب اسلام کی تعلیم ہی غلامی کے رواج کا باعث ہوئی اس لئے کچھ عرصہ بعد انہوں نے ایک جداگانہ رسالہ ابطال غلامی کے نام سے شایع کیا۔ اس رسالہ میں مخالفین کے اعتراضات کے جواب دیے گئے ہیں لیکن ساتھ ہی دو دعوے ایسے بھی کئے ہیں جن سے جمہور مسلمانان اور علماے اسلام نے کبھی اتفاق نہیں کیا اور نہ اس وقت تک اس کو قبول کیا اور وہ یہ ہیں۔

(۱) اسیران جنگ کو غلام و کنیز بنانا کسی آیت قرآنی یا حدیث صحیح سے ثابت نہیں۔

(۲) سورۂ محمد کی ایک آیت ہے جس میں حکم ہے کہ آیندہ قیدیوں کو یا احسان رکھکر چھوڑ دو یا فدیہ لیکر اس ایک آیت کے نازل ہونے کے بعد پھر کبھی آنحضرتؐ نے اسیران جنگ کو لونڈی غلام نہیں بنایا۔

سرسید کے یہ دعوے ایسے نہ تھے کہ علماے اسلام اُن سے اختلاف نہ کرتے چنانچہ اسی زمانہ میں اس رسالہ کا ایک مفصل و مدلل جواب شایع ہو چکا ہے۔

عیسائی مصنفین کا نہایت مشہور و مکروہ اعتراض خود حضور

سرورِ کائنات علیہ التحیہ والسلام کی ذات پاک پر ہے اور وہ آنحضرتؐ کی کثرت ازواج کو ہر قسم کی بدگوئی سے یاد کیا کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ اِس اعتراض کا جواب دیا ہے اور اسلامی عقیدہ کے لحاظ سے وہ جواب کافی اور مسکت بھی ہے لیکن ایک کافر ایک دہریہ، ایک عیسائی اِن جوابات سے خاموش نہیں کیا جاسکتا۔ میور نے اپنی کتاب میں اس اعتراض کو خصوصیت سے اٹھایا ہے اور اسی بنیاد پر کذب و افترا کی بلند عمارت کھڑی کر دی ہے۔ سرسید نے اس اعتراض کا جواب جس خوبی اور عمدگی سے دیا ہے اس سے قبل کسی سے نہیں ہوسکا۔ انہوں نے محض الزامی جوابات، یعنی دوسرے مذاہب کے پیغمبروں کی کثرت ازواج سے بحث نہیں کی ہے۔ بلکہ اس مسئلہ کی ہر حیثیت پر اس قدر تفصیل و تنقید سے گفتگو کی ہے کہ بالآخر قائل ہونا پڑتا ہے کہ آنحضرتؐ کا عمل تو سراسر خیر و برکت تھا۔ لیکن اس بارہ میں جو احکام اسلامی ہیں وہ بھی سرشت انسانی، تمدن و معاشرت اور قانون قدرت کے لئے معین ہیں اور بغیر طلاق و نکاح اور مشروط بتعدد ازواج کے متعدد سوشل مسائل کا حل کرنا ناممکن ہے۔

تطبیق مذہب و سائنس

یورپین مصنفین اور عیسائی معترضین کے رد میں سرسید نے جس قدر اپنے قلم و دماغ سے کام لیا وہ اس وجہ سے زیادہ

وسیع اور قابل لحاظ ہے کہ انہوں نے مغربی طرز استدلال اور علوم جدیدہ سے ایک گونہ واقفیت حاصل کر لینے کے بعد اس کام کو شروع کیا تھا اور اپنی خداداد لیاقت و قابلیت اور بے مثل قوت استدراک سے اپنی تصنیفات اور اپنے خیالات کو اس عمدگی سے پیش کیا کہ ہندستان کے باہر تمام یورپ اور علماء میں اُن کی کوشش وقعت کی نظر سے دیکھی گئی اور نہایت کامیاب ثابت ہوئی لیکن اُن کے پیش نظر اس سے زیادہ اہم کام تھا اور اس کو وہ اپنے اولین فرائض میں داخل سمجھتے تھے، اُن کے نزدیک غیر مذاہب والوں کے اعتراضات کا جواب آسان تھا لیکن اگر یہی اعتراضات اور شکوک خود مسلمانوں میں جدید تعلیم اور انگریزی علوم کی ترقی و رواج کے ساتھ پیدا ہو گئے تو اس اندرونی مرض اور گھر کے چور کا تدارک بے حد دشوار ہو جائے گا چنانچہ اُنہوں نے پوری توجہ مذہب اسلام کے مطالعہ پر صرف کر دی اور ایک خاص مقصد سے اس کو دیکھنا شروع کیا

دین فطرۃ | مذہب اسلام کی حقانیت اس کے اصولوں کا مستحکم و پاک ہونا اُس کی تعلیم کا عین فلاح ہونا اُن کے دل پر اس طرح نقش تھا۔ کہ دنیا کی کوئی طاقت اور کسی قسم کا اثر اس کو مٹا نہیں سکتا تھا۔ اور چونکہ وہ ایسا سمجھتے تھے۔ اسلئے یہ بھی اعتقاد تھا

کہ کسی معترض کا انکار یا کسی فلسفہ و سائنس کا حملہ اسلام کے قوانین کو
کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ ان عقائد سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے
کہ دین اسلام برحق اور بالکل قانون فطرت کے موافق ہے۔ وہ جانتے تھے
کہ بہت سے مسائل جو موجودہ ترقیات اور آزاد خیالی کا ساتھ
نہیں دے سکتے وہ فی الحقیقت سرچشمہ اسلام یعنی کتاب و سنت سے
نہیں بلکہ علماء اسلام اور سلاطین اسلام کے اخذ اثر کا نتیجہ ہیں
اور اگر تقلید شخصی کو چھوڑ کر کوئی مسلمان کتاب و سنت کو مضبوط
پکڑے تو اسکے ایمان میں خلل نہیں آ سکتا۔

چنانچہ اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد انہوں نے قرآن کریم
اور حدیث شریف کا از سر نو مطالعہ کیا۔ اور بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ جدید
اصول پر ایک تفسیر القرآن شروع کی جائے۔

جدید علم کلام کی بنیاد | زمانہ قدیم میں جس قدر تفاسیر علماء اسلام نے
اپنے اپنے زمانہ کی ضروریات کا لحاظ کر کے لکھی ہیں وہ بالعموم انہیں
مسائل سے بحث کرتی ہیں جو اُن کے زمانہ میں قابل لحاظ تھے۔
جن خطرات نے جدید علوم اور انگریزی تعلیم کی اشاعت کے بعد
ہندوستان میں ظہور کیا وہ اس سے قبل کسی زمانہ میں پیش نہیں آئے
یہی سبب ہے کہ اکابر مفسرین اور علماء اسلام کو کبھی اس طرف

توجہ کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی اور نہ اُن کی تفسیر پر اِن مسائل کے
بحث کرتی ہیں سرسید نے جب سائنس اور علوم جدیدہ کے اعتراضات کا
کتاب اللہ اور حدیث نبوی میں جواب تلاش کیا تو اُن کو صاف
نظر آیا کہ یہ اُسی قسم کا معاملہ ہے۔ جیسا کہ عہد عباسیہ میں یونانی فلسفہ
کے رواج سے پیش آیا تھا۔ اُن کا یقین تھا کہ اسلام ازلی اور ابدی ہے
وہ دین فطرۃ ہے اس لئے نہ تو کوئی واقعی اعتراض اُس پر وارد
ہوسکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی بات اس میں قانون فطرۃ کی
خلاف پائی جاسکے۔ لہٰذا جو کچھ تباین اور اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ وہ
سمجھ کا پھیر ہے اور اگر اس میں غور و فکر کیا جائے تو فی الحقیقت
یہ تناقص نہیں بلکہ قانون فطرۃ کی مطابقت ہی نظر آئے گی۔

سرسید کا یہ خیال بے بنیاد اور لایعنی نہ تھا اور نہ کوئی سمجھدار
شخص اس حقیقت سے انکار کرسکتا ہے کہ اگر قرآن کریم ازلی اور
ابدی ہے، اس کو تا دوام دوامِ زندہ اور کارفرما رہنا ہے اور
اُس کی حکومت کبھی انسان کے دلوں سے اُٹھنے والی نہیں
تو یقیناً ہر صدی، ہر عہد، ہر حکومت اور ہر زمانہ میں اُس زمانہ کے قوانین
علوم و فنون اور نظریات کی مطابقت لوگ قرآن کریم میں تلاش
کریں گے اور اس کو ہمیشہ صداقت کا سرچشمہ پائیں گی۔ صداقت

یقیناً غیر فانی ہے اور اس میں دنیا کا کوئی انقلاب کسی قسم کی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ لیکن انسانی دماغ، اُس کا طرزِ استدلال اور اس کا منطق و فلسفہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ انسان اپنے تبدیل شدہ زاویہ نگاہ سے قرآن کو بھی دیکھے گا پس اگر قرآن سچا ہے تو اس کی سچائی ہمیشہ باقی رہے گی اور یہ تبدیل شدہ نقطہ ہائے نظر سچائی کی تلاش میں اسی سطح پر آجائیں گے جس پر قرآن اُن کو دعوت دیتا ہے، اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح اسلام نے یونانی فلسفہ کے مقابلہ کے لئے علم کلام کی بنیاد ڈالی اسی طرح ہر نئے خطرہ کے مقابلہ کے لئے اس کو جدید طرزِ استدلال کی ضرورت ہوگی۔

سرسید نے اپنی تفسیر میں یہ ہی اصول مدنظر رکھا ہے اور اسلامی عقائد کو اپنے استدلال سے موجودہ مسائل علمی اور جدید اکتشافات سائنس کے مطابق ظاہر کیا ہے۔

اصولِ تفسیر | اس مقصد کی کامیابی کے لئے انہوں نے علمائے سلف کی تقلید کو پس پشت ڈال دیا اور محض قرآن و حدیث پر اپنے دعووں کو قایم کیا ہے۔ اسی وجہ سے علمائے اسلام اور عام مسلمانوں سے انہوں نے جگہہ جگہہ اختلاف کیا ہے اور اکثر مسائل اسلامی کی

بالکل نئی تاویل کی ہے چنانچہ (۱) قرآں میں وہ ناسخ ومنسوخ کے قائل نہیں (۲) اجماع کو حجت شرعی نہیں مانتے (۳) تقلید کو واجب نہیں سمجھتے (۴) صحاح ستہ بلکہ صحیحین کی بھی تمام احادیث بغیر درایت کے تسلیم نہیں کرتے (۵) ہر شخص کو اُن مسائل میں جو قرآن وحدیث سے منصوص نہیں ہوے آپ اپنا مجتہد سمجھتے ہیں۔

اِن اصولوں پر تفسیر غالباً اسلام میں سب سے پہلی مذہبی تصنیف ہے اور علاوہ اِن کثیر اختلافات کے جو سر سید نے جمہور علماے اسلام سے کئے ہیں اس اصول تفسیر کے دو عظیم الشان نتائج ناگزیر تھے۔

اجتہادِ مذہبی | اس تفسیر نے مذہبی اجتہاد کی وہ راہ پیدا کردی جو اب تک علما اور عام مسلمانوں کی نگاہ سے پوشیدہ تھی اور جسکے بعد بہت سے وہ پردے نظروں سے اُٹھ گئے جو اب تک مذہبی معاملات میں حائل تھے اور تحقیق وتدقیق میں وہ جرأت وآزادی پیدا ہوگئی جو آغاز عہد اسلام سے اب تک اِن مسائل میں کبھی جائز نہیں سمجھی گئی۔ بلکہ بعض مسلمان حکمرانوں کی سختی اور اثر سے ہمیشہ مذموم خیال کی گئی اور جس کی ضروریات زمانہ کے اقتضا سے

ہمیشہ ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے۔

اجتہادی غلطیاں | لیکن یہ ظاہر ہے کہ جدید علم کلام کی ایجاد اور اسقدر وسیع و مہتم بالشان مسئلہ میں ہزاروں اختلافات اور گتھیوں کو سلجھا کر ایک سیدھی اور نئی راہ قائم کرنا معمولی کام نہ تھا اور نہ ایک ذات واحد کی کوششوں سے انجام پا سکتا تھا اسی لئے سرسید نے اپنے اجتہادات میں باوجود غیر معمولی لیاقت و قابلیت کے بیشمار غلطیاں کی ہیں اور بعض ایسی رکیک اور مہمل تاویلات پر اتر آئے ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیونکر وہ ان طفل تسلیوں سے اپنے علمی دماغ اور تنقیدی ذوق کو مطمئن کر سکے، اگرچہ سرسید نے جہاں کہیں علمائے اسلام سے اختلاف کیا ہے (اور ان کی تعداد بہت ہے) وہاں بعض اکابر علمائے اسلام اور مفسرین اُن کے ہم خیال پائے جاتے ہیں لیکن اکثر مسائل ایسے بھی ہیں جہاں اُن کا اجتہاد تمام دنیا سے الگ ہے اور وہ تنہا اُن عقائد کے حامل نظر آتے ہیں۔

سرسید کا یہ ذوق اجتہاد اور اپنی رائے پر وثوق ہٹ دھرمی کی حد تک پہنچ گیا تھا اور مولانا حالی نے اسی کیفیت دماغی کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

"باایں ہمہ اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ آخر عمر میں سرسید کی خودرائی یا وثوق اُن کو اپنی رایوں پر حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیات قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سنکر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے؟ ہرچند کہ اُن کے دوست اِن تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے"

نتائج اجتہاد — اس جدید طرز استدلال اور علوم جدیدہ و مذہب کی مطابقت کی کوشش کے جو نتائج مترتب ہوئے وہ اسکے بانی سرسید کے حق میں کچھ اور تھے اور قوم کے حق میں کچھ اور سرسید کو ان خدمات کا صلہ یہ ملا کہ تمام ہندوستان میں اُن کی مذہبی تصانیف کی مخالفت ہوئی اور اُنکو کافر و ملحد ٹھیرایا گیا اور بالاتفاق علماء اسلام نے اُن کو دائرہ مذہب سے خارج قرار دیا۔ لیکن جن لوگوں کے لئے سرسید نے یہ مصیبت اپنے سر لی تھی اُن کو یقیناً اُن کی کوششوں سے فائدہ پہنچا اور بہت سے نوجوان تعلیم یافتہ جو انگریزی تعلیم کے اثر سے دہریت و مادیت کی طرف مائل ہوگئے تھے اور بعض اُنمیں سے اسلام کو خیرباد کہہ چکے تھے وہ دوبارہ راہ راست پر آگئے اور یقیناً یہ صلہ

اُن کے دل کو مطمئن اور خوش کرنے کے لئے کافی تھا۔

وجہ تصنیف

جیسا کہ تفصیل سے ظاہر کیا جا چکا ہے، سر سید کا مقصد اس تفسیر کی تصنیف سے اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ جدید تعلیم کے مضر اثرات سے اپنے نوجوانوں کو بچائیں اور اُن کو اسلام سے منحرف نہ ہونے دیں چنانچہ جب انہوں نے اس کام کو شروع کیا ہے اسی زمانہ میں اپنی اک مشہور تقریر میں طلبائے علیگڈھ کالج سے اِن الفاظ میں خطاب کیا تھا۔

"یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اسپر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا ؟"

تفسیر کی نسبت سر سید کی رائے

لیکن باوجود اس شدید ضرورت کے جسکی وجہ سے یہ تفسیر لکھی گئی سر سید کو بخوبی معلوم تھا کہ ان خیالات کو برملا ظاہر کرنا اور اُن کو ہر کس و ناکس تک پہنچانا اندیشہ سے خالی نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اُن کے نزدیک وہ خطرہ جس کی روک تھام تفسیر کے ذریعہ سے کی گئی ہے اسقدر قوی نہ ہوتا تو شاید وہ اس کو کبھی شایع کرنا گوارا نہ کرتے۔ چنانچہ ایک موقع پر خود میاں

کیا ہے کہ " اگر زمانہ کی ضرورت مجھکو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی اپنے اِن خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھہ کر اور ایک لوہے کے صندوق میں بند کر کے چھوڑ جاتا اور یہ لکھہ جاتا کہ جب تک ایسا اور ایسا زمانہ نہ آوے اُس کو کوئی کھول کر بھی نہ دیکھے۔ اور اب بھی میں اس کو بہت کم چھپواتا ہوں اور گراں بیچتا ہوں تاکہ صرف خاص خاص لوگ اُس کو دیکھہ سکیں" سر دست عام لوگوں میں اُس شایع ہونا اچھا نہیں" (حیات جاوید)

دوسری غلطی

سر سید کی یہ رائے سن لینے کے بعد ہر شخص اُن کے مذہبی کاموں اور عقائد پر دوبارہ نظر ڈالنا چاہتا ہے، اور وہ اسباب ڈھونڈھتا ہے جن کی وجہ سے سر سید نے مذہبی تصانیف میں صرف اختلافات ہی نہیں بلکہ بیشمار غلطیاں بھی کیں ذاتی اجتہاد میں غلطی کا امکان ہمیشہ رہتا ہے اور وہ اس موقع پر بھی خلاف توقع نہیں۔ لیکن اک اور سبب بھی تھا جس نے سر سید کو بعض جگہہ نہایت ہی افسوسناک غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا

سر سید نے انگریزی حکومت کے عروج و اقبال کے ساتھہ ہی مغربی علوم کی روشنی اور چمک دیکھی تھی۔ دوسری جانب اپنی قوم کی تنگ خیالی تعصب اور جہالت کی تاریکی نے اُن کو

مایوس کر دیا چنانچہ غدر کے بعد سے مرتے دم تک وہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات اور موانست و محبت پیدا کرنے کی فکریں کرتے رہے اور اس کوشش میں اُن کو یقین ہو گیا کہ انگریزوں کے علوم و فنون، اُن کی ترقیات و ایجادات یقیناً ایسی کارگر ہیں کہ اُن کے مقابلہ میں نہ کسی کی قومی عصبیت چل سکے اور نہ کوئی مذہبی حجت ٹھر سکے گویا وہ جدید ترقیات سے اس درجہ متاثر اور مرعوب ہو چکے تھے کہ بغیر غور و فکر کے اُن کو قبول و تسلیم کر لیتے تھے، چنانچہ اُن کے اکثر کاموں میں یہ مغربی ذہنیت یا اُس کا غیر محسوس اثر نمایاں ہے۔ اجتہاد مذہبی میں بھی انہوں نے مغربی علم و حکمت کو حقائق سمجھ لیا اور تاویل کے لئے اس قدر بڑھائی کہ بجائے مغربی علوم کے مذہب ہی کو آگے بڑھ کر ملنا پڑا۔ اگرچہ مجتہدانہ حیثیت میں یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔ لیکن باوجود اس حقیقت کے اُن کی مذہبی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔

بابِ ہفتم

سیاسی عقائد

سید کے جن کارناموں نے شہرت دوام حاصل کی اور اُن کی جن اصلاحی تحریکوں کو قبول عام کی سند ملی وہ زیادہ تر تعلیمی مذہبی اور معاشرتی حیثیت رکھتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تمام کوششوں کے محرکِ اول وہ سیاسی اسباب تھے جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں نشوونما پا رہے تھے اور جو اول مرتبہ ۵۷ء کے ہیجان عام میں ظاہر ہوئے۔

منزلِ ارتقاء — ہندوستان میں صدیوں سے شخصی حکومت چلی آتی تھی، اور سیاسی آزادی کے وہ معنی جو اس زمانہ میں لئے جاتے ہیں تاریخ ہندوستان میں کہیں نظر نہیں آتے۔ رعایا کو کبھی یہ حق حاصل نہیں ہوا کہ وہ امور سلطنت اور معاملات سیاسی میں اپنی آواز بلند کر سکے۔ وہ اپنی تکالیف اور شکایات کو دوسرے ذرائع سے جو محض التجا و گزارش تک محدود تھے حکام وقت یا خود بادشاہ تک

پہنچا سکتی تھی اور اُن کے تدارک و تصفیہ میں بھی کسی قسم کا دخل نہ رکھتی تھی اسی قدیم دستور کا نتیجہ تھا کہ جب انگریزی حکومت کا تسلط ہو گیا اور ہندوستانی طرح طرح کی تکالیف اور سختیوں سے عاجز آئے تو اگرچہ تشخصی حکومت کے خاتمہ نے گزارش و عرضداشت کی گنجائش نہ چھوڑی تھی لیکن اُن پر سیاسی حقوق اور سیاسی آزادی کے معنی بھی روشن نہ ہوئے تھے اس لئے وہ اپنی شکایتوں کو بجائے اک ہمہ گیر و معنی خیز لفظ "سیاسی" کے مختلف ناموں سے یاد کرتے تھے چنانچہ مذہبی دست اندازی، اقتصادی تباہی، تعلیمی غفلت، قلت معیشت، عام گرانی اور قحط وغیرہ کے نام سے سیاسی شکایتوں نے سر اُٹھایا اور رفتہ رفتہ یہ مواد اندر ہی اندر پکتا گیا اور بالآخر ہنگامۂ غدر کی صورت میں نمودار ہوا۔

غدر | بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ سرسید پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے اسباب غدر کو نہایت جلد اور بالکل صحیح سمجھا تھا اور چونکہ زمانہ غدر کے حالات کا مطالعہ کرنے کے مواقع بھی اُن کو ایسے ملے جو ہر شخص کو حاصل نہ ہو سکتے تھے اس لئے ان کو اپنی رائے پر صرف وثوق ہی نہ تھا بلکہ اِن اسباب اور حالات کا ایسا گہرا نقش اُن کے دل پر ہو گیا کہ وہ کبھی نہ مٹ سکتا تھا نیز جو دل دوز

واقعات اور عبرت ناک مناظر انہوں نے بچشم خود دیکھے تھے اُن کی یاد کبھی دل سے محو نہ ہوتی تھی،

پہلی سیاسی خدمت

چنانچہ "اسباب بغاوت ہند" کے نام سے جو رسالہ انہوں نے ۱۸۵۸ء میں شایع کیا وہ سیاسیات ہند میں اس موضوع پر پہلی مکمل تصنیف ہے جس میں حکومت ہند کی انتظامی حیثیت کا کوئی اصلاح طلب پہلو ایسا نہیں جو کمال وضاحت، صفائی، اور بالغ نظری کے ساتھ نہ پیش کیا گیا ہو۔ اس رسالہ کی اشاعت نے ہندوستان کی مختلف شکایات کو ایک مستقل و پائدار حیثیت میں پیش کیا اور سیاسی تحریکوں کے لیئے ایسا سنگ بنیاد نصب کر دیا جس پر سیاسیات ہند کی مرتفع عمارت اپنے تجربہ، مآل اندیشی اور لیاقت کے مطابق تعمیر کیجا سکتی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں سیاسی جد و جہد کی ابتدا ہی نہ ہوئی تھی انڈین ایسوسی ایشن سترہ برس بعد ۱۸۷۶ء میں بمقام کلکتہ قایم کی گئی، مسٹر سریندر ناتھ بنیرجی کا پہلا سیاسی دورہ اٹھارہ برس بعد ۱۸۷۷ء میں ہوا۔ مسٹر ہیوم کی تحریک سیاسی کے متعلق پہلی اپیل جو بیس سال بعد ۱۸۸۳ء میں شایع ہوئی اور خود انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس چھبیس سال بعد ۱۸۸۵ء میں بمقام بمبئی منعقد ہوا

اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سر سید نے جس وقت اپنی اولین اہم ترین سیاسی خدمت انجام دی ہے، تو ہندوستان کی دنیا سے سیاسیات ہنوز خواب عدم ہی تھی اور سیاسی تحریک عالم وجود میں بھی نہ آئی تھی۔

سر سید نے صرف یہی نہیں کیا کہ ایسے وقت جبکہ فضائے ہند یکسر تاریک اور فرزندان وطن محو خواب تھے اپنی بیدار مغزی اور علو ئے ہمت کا ثبوت دیا ہو۔ بلکہ اُن تمام مسائل سیاسی اور اہم معاملات ملکی کو جو آئندہ سیاسی جد و جہد کا محور بننے والے تھے۔ اپنی قابلیت اور خداداد ذہانت سے اس خوبی اور وضاحت سے پیش کیا کہ سیاسیات ہند میں کسی قسم کی کجروی اور غلط فہمی کا اندیشہ باقی نہیں رہا چنانچہ اسباب بغاوت کی تشریح کرتے ہوئے اُنھوں نے جن اصلاحات کو حکومت کے لئے ضروری سمجھا اُن کا تذکرہ بھی ساتھ ساتھ کر دیا ہے اور آج عام بیچینی کے وجوہ اور مکمل آزادی کے لئے جو تجاویز پیش کی جاتی ہیں وہ بھی اُن سے زیادہ مفید یا موثر نہیں۔

رسالہ اسباب بغاوت | اسباب بغاوت میں سر سید نے لیجسلیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کا شریک نہ ہونا تمام خرابیوں کی اصل وجہ قرار دی تھی

اور اس کے ذیل میں نہایت تفصیل سے اُن بیشمار واقعات اور خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو محض اس ایک وجہ سے پیدا ہو گئیں گویا سر سید نے انقلاب حکومت کی کوشش کا اصلی سبب یہ قرار دیا ہے کہ ملک میں ذمہ دار حکومت نہ تھی۔ اور جب تک نظام حکومت اور قانون ساز جماعت میں ہندوستانی عنصر موجود نہ ہو اس حکومت کو ذمہ دار حکومت نہیں کہا جا سکتا اس اصول کے ماتحت جو خرابیاں بطور نتیجہ پیدا ہوئیں اُن کی تفصیل میں مندرجہ ذیل امور پیش کئے ہیں۔

۱۔ غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تدابیر گورنمنٹ کا۔

(الف) مداخلت مذہبی کا گمان (ب) افسران گورنمنٹ کی نسبت یہ خیال کہ وہ پادریوں کی امداد کرتے اور اُن کی مشنری کالجوں میں روپیہ دیتے ہیں (ج) مشنری اسکولوں اور دیہاتی مدارس میں جدید طریقہ تعلیم کو اشاعت مذہب عیسوی کا ذریعہ سمجھنا وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ جاری ہونا ایسے آئین اور ضوابط اور طریقہ حکومت کا جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کے عادات کے موافق نہ تھی

(الف) ایکٹ ۲ ۱۸۵۰ء کا نفاذ جس کی روسے عیسائی مذہب قبول کرنے والے آبائی ترکہ حاصل کر سکتے ہیں۔

(ب) قوانین ضبطی اراضی لاخراج مجریہ ۱۸۱۹ء

(ج) نامناسب طریق بندوبست (د) قانون اشٹامپ۔

۳۔ ناواقف رہنا گورمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور اُن مصائب سے جو اُن پر گذرتے تھے اور جن سے رعایا کا دل گورمنٹ سے پھٹا جاتا تھا۔

(الف) حکام ضلع کی عام ناواقفیت، تکبر و نخوت اور خودرائی۔

(ب) کمپنی کے زمانہ میں نوٹوں کے رواج سے ملک کی دولت چھن گئی اور تجارت ختم ہوگئی۔

۴۔ ترک ہونا اُن امور کا ہماری گورمنٹ کی طرف سے جن کا بجالانا ہماری گورمنٹ پر ہندوستان کی حکومت کے لئے واجب اور لازم تھا۔

(۱) انگریزوں کی عام بدسلوکی (۲) ہندوستانی امراء کی تحقیر

۵۔ بدانتظامی و بے اہتمامی فوج

اس تفصیل سے جو درحقیقت رسالہ اسباب بغاوت ہند کا اجمالی خاکہ ہے یہ امر بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ سرسید نے عام بےچینی کے اسباب دریافت کرنے میں اسی بیدار مغزی اور سیاسی قابلیت کا ثبوت دیا ہے جو آج آزمودہ کار ماہرین سیاست کا حصہ ہے انہوں نے مذہبی، قانونی، اقتصادی (بہ اعتبار زمینداری و بندوبست)

اور تجارتی (بہ اعتبار نرخ مبادلہ ونگرانی اجناس) ہر قسم کی واقعی شکایات پیش کی ہیں اسی طرح اُن کا علاج بھی وہی تجویز کیا ہے جو آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے یعنی ذمہ دار حکومت۔

سیاسی حالات کا اثر | اس اولیت کے علاوہ جو سرسید کو میدان سیاست میں حاصل ہے اُن کی پبلک زندگی کے اکثر مہتم بالشان کارنامے اگر بنظر غائر دیکھے جائیں تو درحقیقت سیاسی مقاصد کے لئے عالم وجود میں آے۔ علی گڈھ کالج کی بنیا اور تعمیر اصلاح معاشرت کی تحریک قومیت کا تخیل، قومی لباس کا خیال اور بعض مذہبی تصنیفات میں جو جذبہ سیاسی کام کر رہا تھا وہ یقیناً اُن کے اصلاحی ذوق پر غالب تھا علیگڈہ کالج ہندوستان میں پہلا کالج نہیں ہے اس سے قبل متعدد کالج اور چند یونیورسٹیاں قایم ہو چکی تھیں اسکے پروفیسر طلبہ اس کے دارالاقامہ و معمل وکتب خانے بھی نہ دنیا سے نرالے ہیں اور نہ ہندوستان کے لئے کوئی نئی اور عجیب چیز با ایںہمہ علیگڈہ کالج مسلمانوں کی سیاسی، علمی، اور تمدنی حیثیت کا اتنا بڑا مرکز ہو جاتا ہے جس کی مثال ہندوستان ہی نہیں بلکہ اُس زمانہ تک تمام ممالک اسلامیہ میں کہیں نہیں ملتی تھی یہ کیوں محض اس لئے کہ کہ اس کا نشو و نما، اس کی ترقی و وسعت، اُس کی ہر دلعزیزی

وقعت از سرتاپا اس جذبہ سیاسی کے ممنون تھے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ اصلاح و ترقی کا اصلی راز ہے۔ اور اگر مبالغہ نہ خیال فرمایا جاوے تو یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ علیگڈھ کالج یا موجودہ مسلم یونیورسٹی کی حقیقی عظمت و ہردلعزیزی اسی وقت تک قایم رہ سکتی ہے جب تک یہ جذبہ سیاسی (جس کو ایک عرصہ تک ہم جذبۂ قومی" کے نام سے پکارتے رہے) اس دارالعلوم کی روح رواں ہے۔

اصلاح معاشرت کی تحریک میں جو غربیت کی جھلک نظر آتی ہے قومی لباس کا جو التزام علیگڈھ کالج میں شروع ہوا اور وہاں سے تمام مسلمانان ہند میں پھیلا، نیز تبئین الکلام طعام اہل کتاب اور تہذیب الاخلاق کے اثر مذہبی مضامین اس دعوی کا ثبوت ہیں کہ سرسید کی تقریباً تمام پبلک خدمات سیاسی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اُن کو ماہر تعلیم یا ریفارمر کہنے کے بجاے اگر اسٹیٹسمین اور سیاسی رہنما کہا جاے تو یقیناً زیادہ صحیح اور قرین انصاف ہے۔

سرسید کے سیاسی عقائد سرسید کے سیاسی عقائد کو خود انہیں کی تحریروں اور سیاسی کارناموں سے واضح کرنا زیادہ ضروری ہے اور اس مقصد کے لیئے اُن کی وہ تحریر جو اُنھوں نے زمانہ قیام لندن میں

کسی انگریز کے نام لکھی تھی سب سے زیادہ موثر ہے، وہ لکھتے ہیں،

میں مسلمان ہوں، ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں، انہیں دو باتوں سے کہ میں عرب کی نسل سے ہوں، اور مسلمان ہوں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب اور خون دونوں کے لحاظ سے میں سچا ریڈیکل ہوں ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے۔ اور پھر میرا مذہب یعنی اسلام جس پر مجھے پورا اور پکا یقین ہے وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھاتا ہے اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور نہ لمیٹڈ مانرکی کو مانتا ہی بلکہ مورو ثی حکومت ناپسند کرتا ہی ایک پریسیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں اس اسلام پسند کرتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دولت ایک جگہ اکٹھی رہے۔ اسی اصول کے موافق اسلام کے بانی نے یہ قاعدہ بنایا کہ بعد فوت ہو جانے کسی شخص کے اس کی جائداد بہت سے آدمیوں میں تقسیم ہو جاوے کیونکہ کتنی ہی زیادہ جائداد کیوں نہ ہو وہ بعد دو نسلوں کی یقیناً بہت سے حصوں میں تقسیم ہو جاوے گی۔ پس میں دونوں طرح کیا

بلحاظ مذہب اور کیا بلحاظ خون کے ریڈیکل ہوں۔

لیکن ہمارا مذہب جس نے یہ خیال آزادی کا میرے دل میں پیدا کیے اُس نے اور باتیں بھی سکھلائی ہیں ایک یہ کہ اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہو جائیں جو کہ ہم کو مذہبی آزادی دیتی ہے۔ انصاف سے ہم پر حکمرانی کرتی ہے، ملک میں امن قایم رکھتی ہے اور ہماری جان و مال کو محفوظ رکھتی ہے۔ جیسا کہ انگریزی سلطنت ہندوستان میں کرتی ہے تو اس حالت میں ہم کو اس کا تابعدار اور خیر خواہ رہنا چاہیے دوسرے یہ کہ وہ ریڈیکل اصول جو ہم نے اپنے باپ دادا اور مذہب سے سیکھے ہیں اُن پر ہم کو صرف اسی حالت عمل کرنا چاہیئے جب کہ زمانہ کی حالت اُن کے عمل میں لانے کے موافق ہو۔"

سرسید نے اِن الفاظ میں تین اصول بیان کیے ہیں اور یہ ہی اُن کے سیاسی عقائد کا خلاصہ ہیں یعنی وہ اپنے آپ کو ہندوستانی مسلمان کہتے ہیں اور ریڈیکل (انتہا پسند) بتاتے ہیں اور جمہوری حکومت کو پسند کرتے ہیں۔ اگر اِن اصولوں کی عملی شکل اُن کی زندگی میں

تلاش کی جائے تو یقین ہے کہ بہ کثرت ایسی مثالیں ملیں گی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو عقیدہ رکھتے تھے اوسی پر عمل پیرا بھی تھے۔

سیاسی نصب العین | لیکن زمانہ موجودہ کے کسی سیاسی رہنما کی محض اس بیان پر کہ وہ ریڈیکل (انتہا پسند یا انقلاب پسند) ہے کوئی شخص اُس کی صحیح سیاسی خیالات کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا اس لئے کہ ان الفاظ کے معنی ملکی حالات اور زمانہ کی رفتار سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں، ایسی صورت میں پہلا سوال یہ ہوگا کہ ہندوستانی سیاسیات میں آپ کا کیا نصب العین ہے! سر سید نے اس سوال کا جواب اسی عبارت کے آخری حصہ میں دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُن کے نزدیک انگریزی حکومت کا تابعدار اور خیر خواہ رہنا چاہیئے" اِن کی مستقل رائے تھی کہ ہندوستان کی فلاح صرف اسی میں ہے، کہ وہ برطانوی حکومت کے زیر سایہ رہے۔ لیکن ہم کو سر سید کی اس رائے پر مطلق تعجب نہ ہونا چاہیئے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ کا کوئی ماہر سیاست موجودہ اصول سیاسیات کا حامی نہ تھا بلکہ ممکن ہے کہ بعض نامور رہبرانِ قوم نصب العین کے معاملہ میں سر سید سے بہت پیچھے ہوں۔ اس لئے کہ اگرچہ انڈین نیشنل کانگریس ۱۸۸۵ء میں عالم وجود میں آچکی تھی لیکن اس کا نصب العین "

گداگری" سے آگے نہ بڑھا تھا اور بجز اظہار شکایات کے اور کوئی طریقہ حصول مقصد کا اس کے پیش نظر نہ تھا۔ دو برس کی مسلسل جدوجہد اور سیاسی تجربہ کے باوجود وہ اس معاملہ میں نہ ہمت کا ثبوت دے سکی اور نہ وہ دانشمندی کا اظہار کر سکے بلکہ اُس کی حیثیت اک گم کردہ راہ کی تھی جسکو نہ منزل کا پتہ تھا اور نہ نشان راہ پر وثوق چنانچہ ۱۸۹۹ء میں جو کانسٹیٹیوشن یا دستور کانگریس نے طیار کیا اس میں بھی نصب العین کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے

"آئینی طریقوں سے سلطنت ہند کے باشندوں کی اغراض و فلاح کی ترقی"

ان مہمل و بے معنی الفاظ کو سامنے رکھکر کانگریس نے مسلسل بیس سال تک اپنی جدوجہد جاری رکھی اور اس تمام عرصہ میں باوجود بحث و مباحثہ اصل سوال یعنی نصب العین طے نہ ہوسکا۔ سب سے پہلے دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں ۱۹۰۶ء میں بمقام کلکتہ "نوآبادیات کے طرز پر حکومت خود اختیاری" کے لئے ایک تجویز کانگریس میں منظور کی گئی، لیکن اس وقت بھی اس کو دستور کانگریس میں داخل نہیں کیا گیا۔

حکومت خود اختیاری | سرسید کا یہ عقیدہ کہ ہندوستان میں انگریزی

حکومت کا وجود باعث خیر و برکت ہے اُن اصولوں پر مبنی تھا
جو اُن کے سیاسی عقائد کا اہم جزو ہیں وہ شخصی حکومت کے قائل
نہ تھے اور ہندوستانی قوم کے نسبت یقین رکھتے تھے کہ ان میں
حکمرانی کی صلاحیت باقی نہیں :

اُن کی رائے تھی کہ ایسی صورت میں ہندوستان کو خود حکومت کرنی اور جمہوری
اصول پر سلطنت کی ذمہ داریاں اُٹھانے کی قابلیت حاصل کرنے کیلئے
انگریزی حکومت سے سبق لینا چاہیے اور اسی ضرورت کے لئے
وہ موجودہ حکومت کے وجود کو دل سے پسند کرتے تھے، چنانچہ
لارڈ رپن کے زمانہ حکومت میں جب لوکل سلف گورمنٹ کا
قانون پاس ہوا۔ اور میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ قایم ہوے تو
کونسل میں سر سید کی تقریر کا پہلا جملہ یہ تھا۔

”میں اس بات کے خیال سے خوش ہوں کہ میں اس قدر
عرصہ تک زندہ رہا کہ میں نے اُس دن کا آغاز دیکھ لیا
جب کہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سلف
اور سلف گورمنٹ کے وہ اصول سیکھنے کو ہے جنہوں نے
انگلستان میں ریپرزنٹیٹو انسٹیٹوشن پیدا کیئے ہیں اور
اس کو دنیا کی قوموں میں بڑا بنا دیا“

اس عقیدہ کے حامی آج بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں اور اس وقت تک یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ موجودہ حالت میں ہندستانی حکومت ہند سنبھال لینے کے قابل ہیں یا نہیں۔

اِن عقائد کی وضاحت کے بعد سر سید کی سیاسی جدوجہد کا دائرہ بہت تنگ ہو جاتا ہے اور صرف حکومت کے زیر اثر سیاسی مفاد کی جدوجہد باقی رہ جاتی ہے۔

عام بھلائی کا خیال

لیکن اُن کے سیاسی کاموں میں وہ تنگ نظری یا تنگ ظرفی نظر نہیں آتی جو کم حوصلہ اور پست ہمت لوگوں کا شعار ہے اس لئے کہ اگرچہ ان کا سیاسی مطمح نظر زیادہ بلند اور شاندار نہ تھا لیکن یہ کم نظری پست ہمتی یا نادانی کے باعث نہیں بلکہ اپنی قوت کے صحیح اندازہ اور ضروریات زمانہ سے واقفیت و دانائی کی بنا پر تھی چنانچہ انہوں نے زمانہ غدر کے بعد ہی جب اپنی پبلک خدمات کی ابتدا کی تو اک عرصہ تک ملکی معاملات میں قومی تفریق یا فرقہ بندی کے اصول کو جائز نہیں رکھا اور جس قدر کام وہ کرتے تھے اِن میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کی بھلائی اور اِن کے حقوق کا یکساں خیال رکھتے تھے چنانچہ زمانہ غدر کے بعد مسلسل دس سال انہوں نے جس قدر بڑے کام کئے اور پبلک خدمات انجام دیں

ان میں ہندو اور مسلمانوں کو شریک رکھا

مراد آباد کا یتیم خانہ۔ غازی پور کا مدرسہ، سائنٹفک سوسائٹی برٹش انڈین ایسوسی ایشن علیگڈھ صوبہ جات متحدہ میں تعلیمی کمیٹیاں وغیرہ اس زمانہ کے مشہور کارنامے ہیں ان میں سے کوئی کام ایسا نہ تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک نہوں اور نہ جس کی کامیابی اُن کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ نہو۔

اردو ہندی کا جھگڑا | لیکن یہ حالت عرصہ تک قایم رہنے والی نہ تھی اور جن پر اسرار طریقوں سے ہندوستان کی ان دونوں قوموں میں مخالفت پیدا کی جاتی رہی ہے، اس کے ظہور کا وقت بھی اب آگیا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہندو مسلمان کئی صدی کی امن و آشتی کے بعد اب "جمہوری اور غیر جانب دار، حکومت برطانیہ" میں اتفاق و یگانگت سے نہیں رہ سکتے چنانچہ جو تدابیر اس مقصد کے لئے کی گئی تھیں وہ زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں میں کامیاب ہوئیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندو مسلم اختلافات نے تعلیم یافتہ جماعت میں سر اُٹھایا اور اب رفتہ رفتہ یہ زہر سارے ملک میں پھیل گیا۔

سر سید کے زمانہ میں سب سے پہلے ۱۸۶۷ء میں اردو ہندی کا جھگڑا شروع ہوا۔ بنارس و الہ آباد میں ہندی کمیٹیاں قایم ہوئیں

اور وسیع پیمانہ پر صوبہ جات متحدہ میں یہ تحریک شروع ہوگئی کہ عدالتوں اور سرکاری کاغذات میں ہندی زبان ہندی رسم الخط کے ساتھ استعمال کی جائے سرسید کا بیان ہے کہ۔

"انہیں دنوں میں جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے۔ میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہوکر میری گفتگو سن رہے تھے، آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کیا کرتے تھے، میں نے کہا کہ اب مجھ کو یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔"

ہندوستان کی سیاسی جد وجہد میں ہندو مسلم اتحاد کا وجود ایک ناگزیر عنصر ہے، اور بغیر اس اتحاد کے کسی قسم کی تحریک کامیابی حاصل نہیں کرسکتی۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی

عدم موجودگی میں کوئی زبردست سیاسی تحریک فروغ پا سکے
اسی وجہ سے سر سید کی سیاسی بلند نظری دو زبردست حملوں سے
مجروح ہو گئی۔ اِن کا نصب العین اس لئے ضعیف ہو گیا کہ ملک میں
عزم و ہمت کا نام نہ تھا اور اُن کا دائرہ عمل اس لئے تنگ ہو گیا کہ
معاملات سیاسی میں اتحادِ عمل اور اتحادِ مقاصد کی کوئی راہ نہیں نکلتی تھی

سیاسی بیداری کے لئے ابتدائی کام

لیکن اِن حدود کے اندر اُن کے جس قدر کارنامے ہیں ان میں سے ہر ایک اُن کی سیاسی قابلیت
بیدار مغزی، اصابت رائے، اور مضبوط عزم و ارادے کا ثبوت ہیں
چنانچہ ہندوستان کی سیاسی حالت کا بخوبی اندازہ کرنے کے بعد
جب انہوں نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی کوشش کی تو
ساتھ ہی ساتھ اُن میں وہ طاقت بھی پیدا کرنی چاہی جو مسلمانوں کو
اس قابل بنائے کہ وہ اپنی روز افزوں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ
ہو سکیں اور اُن کی سعی نے مسلمانوں کو بالآخر ایسی شاہراہ پر پہنچا دیا
جہاں سے وہ بلا خوف خطر منزلِ مقصود تک بغیر مزید اعانت و رہبری کے
پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ علیگڈھ کالج کی تعمیر، مذہبی مسائل میں رواداری
کی تعلیم، قومی اور ملکی تعصبات سے بیزاری، علو ہمت اور بلند
خیالی کی کوشش وہ اسی مقصد سے کرتے رہے کہ مسلمان اگر اپنی گذشتہ

حکومت حاصل کرنے میں کامیاب نہ بھی ہوں تو اُن میں یہ طاقت اور لیاقت پیدا ہو جائے کہ وہ غیر حکومت میں عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں اور جب موقع ملے تو ملکی آزادی حاصل کرنے میں اپنی ہمسایہ قوموں سے کسی طرح پیچھے نہ رہیں۔

غیر قوموں کے اتحاد عمل | باوجود ان رکاوٹوں کے سر سید کو ملکی مسائل میں اتحاد عمل اور اتفاق باہمی کی جس قدر گنجائش نظر آتی تھی وہ اس سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے اور حصول مقصد و ترقی اتحاد کی کوئی امکانی کوشش اٹھا نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ البرٹ بل کے زمانہ میں ان کی کونسل کی تقریریں اور اخبارات کے مضامین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک اور قوم کی عزت کا خیال اور ہندوستان کی فلاح و بہتری کی آرزو میں وہ کسی قوم پرست اور وطن دوست سے کم نہیں ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی سر سید کی خدمات سیاسی کا اعتراف تمام ملک کی طرف سے نہایت بلند آہنگی سے کیا گیا انڈین ایسوسی ایشن لاہور نے ۱۸۸۴ء میں جو ایڈریس سر سید کو دیا تھا اس میں اُن کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"آپ اس زمانہ میں جبکہ آپ مجلس مذکور (کونسل) میں کام کرتے تھے بے طرفدارانہ تمام فرقوں کی بہبودی کی فکر

رکھتے تھے اور قومی خیالات کی ترجمانی دلیری و راستبازی سے
فرماتے تھے اور نہایت توجہ و سرگرمی سے قومی مفاد کا لحاظ
رکھتے تھے۔ آپ ہماری اور ہمارے ہموطنوں کی طرف سے
دلی احسان مندی کے مستحق ہیں"

اسی طرح برہمو سماج اور آریہ سماج کے ایک متفقہ وفد نے ان الفاظ میں اظہار خیال کیا تھا۔

"ہم ممبران آریہ سماج اور برہمو سماج لاہور تمام ہندوؤں
کی طرف سے۔ آپ کی اُن کوششوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں
جو آپ نے قانونی کونسل میں اور نیز مختلف اوقات میں
ہندوستان کے لئے کی ہیں۔ ہندو راجہ مہاراجہ جن سے
بہت کچھ امید کی جاتی تھی ملک کے لئے خیر خواہ ثابت ہوئے
لیکن آپ نے حب الوطنی کو ہاتھ سے نہ دیا اور البرٹ بل
اور دیگر مفید تجاویز کی کونسل میں استقلال کے ساتھ
حمایت کی"

البرٹ بل | ہندوستان کی تاریخ آزادی میں البرٹ بل خاص اہمیت رکھتا ہے اور کسی شخص کو اس واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ابتدائے حکومت انگریزی کے بعد جس واقعہ نے ہندوستانی

قوم کی آنکھیں کھولیں اور اُن پر موجودہ حکومت کی حقیقت ظاہر کی وہ یہ ہی قانون تھا۔ البرٹ بل کا صرف یہ مقصد تھا کہ انگریزوں کے مقدمات جب ہندوستانی عدالتوں میں جائیں تو ان کی عدالتی کارروائی بھی اسی طرح ہونی چاہیئے جیسی دوسرے مقدمات میں ہوتی ہے۔ اب تک انگریزوں کے مقدمات کی سماعت کا اختیار صرف انگریز حکام ہی کو تھا۔ اگر عدالت میں کوئی انگریز حاکم نہ ہو تو مقدمہ ہائی کورٹ کے انگریز ججوں کے فیصلہ کے لئے جاتا تھا یہ نسلی امتیاز اور قومی تفریق کی ایسی مثال ہے جس کی نظیر دنیا کے کسی مہذب و قابل وقعت قانون میں نہیں مل سکتی۔ لارڈ رپن نے اسی الزام کو اپنی قوم سے دور کرنا چاہا تھا لیکن انگریزی قوم اور خود سر کاری حکام نے اس کے خلاف وہ طوفان اُٹھایا کہ خود لارڈ رپن کی کی جان کے لالے پڑ گئے اور بالآخر اس قانون کا بھی وہی حشر ہوا جو ہندوستان میں اکثر نیک ارادوں کا حکومت انگریزی کی استبدادیت اور انگریزی قوم کی رعونت کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔

سر سید نے اس موقع پر نہایت جرأت و استقلال کے ساتھ مخالفت کا مقابلہ کیا اور کونسل میں مجوزہ قانون کی پوری قوت کے ساتھ حمایت کی۔ اس سے قبل ۱۸۷۸ء میں جب مسٹر سریندر ناتھ بنرجی نے

پہلی مرتبہ سیاسی مقاصد کے لئے دورہ کیا تب بھی سرسید اُن کے ہم خیال اور اِس جلسہ کے صدر تھے جو علیگڈھ میں ہوا۔

سیاسیات اور مسلمان

لیکن اس عرصہ میں اُن کو پبلک زندگی اور قومی کاموں کا جو وسیع تجربہ ہوا تھا اُس کی بنا پر جہاں وہ ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو چکے تھے وہاں مسلمانوں کی ترقی سے بھی تقریباً مایوس تھے اور اگرچہ اُنھوں نے مایوسی کے الفاظ کبھی عام جلسوں یا تقریروں میں اپنے مُنہ سے نہیں نکالے لیکن اپنے احباب سے وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کی اصلاح و ترقی کی کوئی امید نہیں اور فی الواقع مسلمانوں کی قوم جن گوناگوں امراض و اوہام میں مبتلا تھی۔ اور جس غفلت و افلاس اور جہالت نے اُس کو گھیر لیا تھا اس کے اعتبار سے کسی طرح گمان نہ ہوتا تھا۔ کہ خدا اپنے فضل و کرم سے اس یاس انگیز و حسرتناک حالت کو امید و کامیابی سے بدل دے گا۔ مسلمانوں کے پاس ہندوستان میں ایسی تجارت تو کبھی نہ ہوئی جیسی کہ ہندوؤں کی تھی اور نہ امید تھی کہ وہ جلد اس طرف توجہ کریں گے اس لئے کہ سرسید کے زمانہ تک مسلمانوں کے لئے تجارت کی طرف متوجہ ہونا انتہائی شرم و غیرت کی بات خیال کی جاتی تھی۔ زمینداری بہ حیثیت پیشہ کے باقی نہ تھی

چند رہ گئی تھیں باقی تھیں وہ بھی زیادہ عرصہ تک باقی رہتی نظر نہ آتی تھیں
اور سب سے بڑی مصیبت عالم جہالت اور تنگ نظری تھی جس نے
اتحاد باہمی کو فنا کر دیا اور سعی وہمت کی طاقت باقی نہ چھوڑی
اسی وجہ سے سرسید کا خیال تھا کہ اگر مسلمان کبھی سیاسی اقتدار
حاصل کر سکتے ہیں تو وہ جب ہی ممکن ہے کہ اول اُن میں تعلیم
بلند نظری، فراخ دلی اور جذبۂ ایثار و قومیت پیدا ہو جائے۔
چنانچہ اُنھوں نے اپنی تمام توجہ مسلمانوں کی اندرونی اصلاح
اور اُن میں جدید تعلیم کی اشاعت و ترقی پر صرف کر دی۔

کانگریس سے اختلاف | انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس ۱۸۸۵ء میں ہوا
سرسید نے کانگریس کے مقاصد سے اظہار ہمدردی نہیں کیا اور نہ
اُس میں شریک ہوئے لیکن دو سال تک کسی قسم کی مخالفت کا بھی
اظہار نہ کیا۔ اس دو برس میں کانگریس کی ہر دلعزیزی ملک میں بڑھتی
جاتی تھی اور اسی کے ساتھ حکومت کی مخالفت بھی رفتہ رفتہ نمایاں
ہو رہی تھی۔ سرسید نے محسوس کیا کہ ہندو مسلم اتحاد کی عدم موجودگی
میں کانگریس سے کسی زبردست سیاسی کامیابی کی توقع نہیں ہو سکتی
دوسری طرف مسلمان اس قابل ہی نہیں کہ وہ کانگریس کی شرکت سے
اُس کی اعانت کر سکیں یا اُس کی رونق بڑھا سکیں ایسی صورت میں

کانگریس کی شرکت کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ وہ اپنی تعلیمی ترقی اور قومی اصلاح کی طرف سے بھی غافل ہو جائیں گے اور سیاسی میدان میں بھی کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکیں گے چنانچہ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو بمقام لکھنو انھوں نے کانگریس کی علانیہ مخالفت کی اور مسلمانوں کو سیاسیات سے علیحدہ رہنے کی نصیحت کی

حق انتخاب | یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندو مسلم اختلافات تعلیم یافتہ جماعت میں پیدا ہو چکے تھے اور سرسید کو یقین ہو گیا تھا کہ اِن دونوں قوموں کا ملکی اغراض کے لئے ایک جگہ جمع ہونا نہایت دشوار ہے۔ اسی بنا پر وہ اصول نیابت اور حق انتخاب کے متعلق بھی اکثریت اور قلت کے جھگڑوں سے متاثر ہو گئے تھے اور ہمیشہ یہ سوچا کرتے تھے کہ جب مسلمان علم و عمل سے بھی عاری ہوں۔ تو عام ملکی مسائل میں اور میدان سیاسی میں وہ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کس طرح کام کر سکتے ہیں اگر یہ طریقہ ملک میں جاری ہو گیا تو اس میں سراسر مسلمانوں کا نقصان ہوگا چنانچہ اسی تقریر میں انہوں نے کہا کہ

"اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح

مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ
ہندوؤں کی تعداد بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے۔ پس جو طریقہ
انتخاب کا قرار دیا جاوے گا اُس سے اگر ایک مسلمان
ممبر ہوگا تو چار ہندو ہوں گے اور اگر بفرض محال کوئی
ایسا قاعدہ رکھا جاوے جس کے رو سے ہندو اور مسلمان
دونوں قوموں کے ممبر برابر رہیں تو موجودہ حالت میں
ایک مسلمان بھی ایسا نہ نکلے گا جو ویسرائے کی کونسل میں
بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے لائق ہو۔ میں نے کونسل میں
چار برس کام کیا ہے مگر ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ مجھ سا ذلیل
اور نالائق اور مجھ سے بدتر کوئی ممبر نہیں ہوسکتا۔"

سر سید کو جو خوف کثرت و قلت (میجارٹی و مائنارٹی) کا تھا
وہ اُس زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کی قوم بالکل کس مپرسی کی
حالت میں تھی اور بھی زیادہ خوفناک اور واقعی معلوم ہوتا تھا۔
اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اُس زمانہ میں یقیناً مسلمان
قومی حیثیت سے سیاسی کاموں کے اہل نہ تھے اور اس اعتبار سے
اُس زمانہ میں سر سید کا انڈین نیشنل کانگریس کا مخالف ہونا بلا
تشبیہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آج ہمارے اکثر سیاسی رہنما انتہائین

یا بالشویکی تحریک کے مخالف ہیں۔ علاوہ بریں کانگریس الیسی صورت میں کہ اُس کا کوئی صحیح نصب العین نہ ہو اور ملک کی عام حالت اتحاد باہمی کے خلاف ہو کسی کامیابی کی توقع بھی نہیں کر سکتی تھی اور جن کمزوریوں کے خیال اور اختلافات کے اندیشہ سے سرسید نے اُس وقت مخالفت کی تھی وہ آج بھی اُسی طرح قومی یکجہتی اور سیاسی اتحاد کے راستے میں حائل ہیں جیسے کہ اُس زمانہ میں تھے حق نیابت، کثرت و قلت کے مسائل تو ہمیشہ سے مابہ النزاع تھے لیکن اس زمانہ میں تو قربانی، تعزیہ داری، آرتی اور باجہ ہر چیز ہندو مسلم اختلافات کا سنگ بنیاد بنی ہوئی ہے۔

بعض مضر نتائج | لیکن کانگریس سے علیحدگی اور اس پالیسی کے بعض مضر اثرات بھی ہوئے۔ مسلمانوں نے اُس زمانہ کی ہنگامی ضرورت کو دوامی فرض کر لیا اور تعلیم جس کو اُن کے مقاصد کا ذریعہ قرار دیا تھا اُنھوں نے خود اُسی کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ چنانچہ گذشتہ چند سال میں اُنھوں نے بعض نہایت اہم سیاسی فرائض کو پس پشت ڈال دینے میں بھی تامل نہ کیا۔ نیز حکومت کی اعانت و امداد کے بھروسہ نے اُن کی ہمت و سعی کو اس قدر مضمحل کر دیا کہ ایک عرصہ تک وہ اُس عزم و استقامت کا ثبوت نہ دے سکے جو سیاسی زندگی کا

جزو لاینفک ہے؛

پیٹریاٹک ایسوسی ایشن | سر سید اگر اسی قدر کرتے کہ مسلمانوں کو کانگریس سے بالکل علیحدہ رکھتے اور اُن کو مسئلہ تعلیم کے علاوہ کسی سیاسی یا ملکی تحریک پر متوجہ ہونے دیتے تو غالباً درست ہوتا۔ لیکن انہوں نے صرف اتنی قدر نہیں کیا بلکہ کانگریس کے اصول کار سے اختلاف کیا اور خود میدان سیاسیات میں آئے اور کانگریس سے مختلف طرز عمل اختیار کیا۔ اور اس سیاسی جماعت کو جسکو پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کا نام دیا گیا تھا جتنے الوسع ملک میں مقبول بنانا چاہا۔ اس انجمن کا مقصد محض کانگریس کی مخالفت نہ تھی۔ بلکہ وہ سیاسیات ہند میں ایک پروگرام لیکر آئی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کا صرف یہ مقصد تھا کہ وہ کانگریس کے پیدا کردہ جوش آزادی کو اپنی سست رفتاری اور اعتدال پسندی سے جس قدر ممکن ہو کم کردے لیکن جس طرح سر سید رفتار زمانہ کے دوسرے اثرات سے مقابلہ نہیں کرسکتے تھے اُسی طرح یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ اُس روح کو جو سیاسیات ہند میں پیدا ہو چکی تھی کسی حدود و آئین کا پابند بنا دیں اُن کا یہ مخالفانہ طرز عمل ممکن ہے کہ اُن کو اُس خودرائی کے سبب سے ہو جو آخر عمر میں

اُن میں پیدا ہو گئی تھی لیکن کسی طرح نا قابلِ التفات نہیں قرار پا سکتا۔ اس لئے کہ اگر اُن کی مخالفت کو اس نام سے یاد کیا جائے۔ تو اس زمانہ میں لبرل و نیشنلسٹ اور اُن کے اُصول با سلام و اشتمالیت کے مخالفین کی نسبت کیا کہا جا سکتا ہے۔ کیا آج سے بیس برس بعد ہمارے واجب الاحترام سیاسی رہنما اُسی مقام پر نظر نہ آئیں گے جہاں آج سے پچیس سال قبل سرسید نظر آتے ہیں

سرسید نے اپنی تقریر میں جہاں کانگریس کی مخالفت کی وہاں یہ اصول بھی بیان کیا تھا کہ "گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اپنے تئیں اُن حقوق کا مستحق بناؤ" اُن کا خیال تھا کہ ہندوستانی جس قدر لیاقت و قابلیت حاصل کرتے جائیں گے حکومت بھی مجبوراً اُسی قدر مہربان ہوتی جائے گی۔

آزادیٔ رائے | سرسید نے بجز اس علیٰحدگی کے جو کانگریس سے بعض حالات کی وجہ سے انہوں نے اختیار کر لی تھی ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کی اور کبھی اس بات کو پسند نہیں کیا کہ سیاسی اور ملکی معاملات میں فرقہ وارانہ تفریق قائم کی جائے اور نہ کبھی اپنی رائے کو خاص اغراض و مصالح کا پابند کیا بلکہ ہمیشہ نہایت آزادی کے ساتھ وہ اپنے خیالات ظاہر کرتے رہے۔

اثنائے سفر لندن میں جہاز پر اُن کے ہمراہیوں میں لفٹنٹ گورنر پنجاب بھی تھے۔ اُنھوں نے سر سید پنجاب کے طرز حکومت کی نسبت سوال کیا جس کے جواب میں اُنھوں نے کہا کہ۔

"ہاں ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ (استبدادی حکومت) ہے
اور بلاشبہ سکھوں کی عملداری سے ہزار درجہ بہتر ہے۔
لیکن شاید پنجاب کے لوگ اس سے خوش ہوں کیونکہ
ان کو آگ (یعنی سکھوں کی عملداری) میں سے نکال کر
دھوپ میں بٹھایا ہے مگر ہم لوگ اس کو پسند نہیں کرتے ۔ ۔۔
جہاں تک مجھ کو معلوم ہے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غدر میں
جہاں اور سزائیں اہل دہلی اور اُس کے متعلق اضلاع
کو دی گئیں منجملہ اُنہیں سزاؤں کے ایک یہ بھی سزا ہے
کہ دہلی اور اُس کے متعلق اضلاع میں پنجابی انتظام کیا گیا
اور بے آئین ملک بنا دیا گیا۔

ہندو مسلم اتحاد

اسی طرح ہندو مسلم اتحاد کے متعلق اُنھوں نے بارہا اظہار خیال کیا ہے وہ اس اتحاد کے اس قدر دلدادہ تھے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے گاے کی قربانی ترک کر دینے کے لئے بھی تیار تھے اور جیسا کہ حیات جاوید (صفحہ ۲۷۲) میں ظاہر کیا ہے

ہمیشہ اُن کی یہ رائے رہی ہے کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لئے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت کی بات ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کی نسبت اُن کی متعدد اور مشہور تقریروں سے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں جن سے سرسید کے خیالات اس اہم مسئلہ کے متعلق (جو آج بھی اُسی قدر نازک و اہم ہے جیسا کہ اُن کی حیات میں تھا) واضح ہو جائیں گے۔

"ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے ایک آب و ہوا میں دونوں شریک ہیں، ایک دریا کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے، ایک کو دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں پس کسی چیز کو جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہو اِن دونوں کا علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔"

"قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے گو اُن میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اسے

ہندو مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے
رہنے والے ہو! کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے
کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین ک
گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے! اسی پر مرتے ہو اور اسی پر
جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے
ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں
اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔"

سرسید کی ایک دوسری تقریر کا یہ مشہور جملہ زبان زد خلائق
ہو گیا ہے اور اس خلوص کا پتہ دیتا ہے جس کی بنا پر یہ الفاظ
ان کے دل سے نکلے اور زبان سے ادا ہوئے۔

"اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں
کہ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت
اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں
آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائیگی
اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانی ہو جاویگی
پس اے ہندوستان کے رہنے والو ہندو اور مسلمانو اب تم
اختیار ہے کہ چاہو اس دلہن کو بھینگا بنا و چاہو کانا۔"

باب ہشتم

سید کی شخصیت

جس طرح کائنات عالم میں ہر ذی حیات کے لئے عروج و زوال کی ناگزیر منزل پیش آتی ہے قوموں کی تاریخ بھی اس لازوال قانون سے مستثنیٰ نہیں ہوتی۔ ہر قوم کو اپنے زمانہ ارتقا سے گزر کر اوج کمال اور نقطۂ زوال تک پہنچنا لازمی ہے، لیکن ان ارتقائی منازل اور اختلافی حالات میں مشابہت ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ بعض قوموں کی ترقی دوسری قوموں کے کمال سے مختلف ہو اور ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ ہر قوم کا اک خاص عہد و زمانہ ہوتا ہے اور اس کو ان خصوصیات کا جو اس عہد کے لئے مخصوص ہوں اپنی ارتقائی ترقی میں لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ یہ ہی سبب ہے کہ مختلف قومیں مختلف کمالات و ترقیات کے لئے جو ان کے عہد سے مخصوص تھیں مشہور ہوتی ہیں۔

دور جدید — ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کا عہد زریں اس وقت ختم ہوا ہے کہ انیسویں صدی کے کمالات ظاہر ہو چکے تھے۔ اور نظام عالم کئی صدی کی متوازن و مستحکم رفتار کے بعد ایک عظیم الشان انقلاب کے لئے آمادہ نظر آتا تھا۔ ہندوستان میں اس انقلاب کا اثر اور اُسکی رفتار اس لئے غیر معمولی ہوگئی کہ اسلامی حکومت کا زوال اور انیسویں صدی کا آغاز، گویا دنیا کے دو زبردست انقلابات ایک ہی وقت میں واقع ہوے۔

زوال سلطنت کے بعد (جو قومی تنزل کا آخری مرتبہ ہے) جس افسوس ناک حالت پر مسلمان پہنچ گئے تھے۔ اس کی عبرت ناک تصویر چند الفاظ میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ قومی زندگی کا کوئی پہلو اور انفرادی و اجتماعی کوئی حیثیت ایسی نہ تھی جو ذلت و ابتری کا مرقع نہ ہو اور جسقدر خصائل حمیدہ قومی و انفرادی زندگی کا جزو ہیں وہ ایک ایک کر کے فنا نہ ہو گئے ہوں۔

اسی طرح انیسویں صدی کا آغاز تہذیب مشرق کا اختتام اور عروج مغرب کا اعلان تھا۔ اور یہ اتنا بڑا انقلاب تھا کہ عہد گذشتہ و عصر جدید کے حالات میں کسی قسم کا رشتہ اتحاد نظر نہیں آتا تھا مشرق نے زندگی اور معاملات دنیا کو جس نظر سے ہمیشہ دیکھا وہ

تہذیب مغرب میں ناقابل قبول تھی مغرب بالکل مختلف اور بعض جدید اصولوں کو حالات زندگی اور معاملات دنیاوی پر منطبق کرنا چاہتا ہے اور ان اختلافات نے مشرقی خیالات، معتقدات اور محسوسات کو اس طرح متنزلزل کر دیا ہے کہ اس کی حیثیت اب معدوم ہے اور تہذیب مغرب کی فتح خود مشرقی ممالک میں منائی جا رہی ہے۔

انقلابات دہر کے یہ دو عظیم الشان طوفان تھے جن کی طغیانی وطلاطم کے ہیجان میں مسلمانوں کی عقل گم اور اُن کے ہوش وحواس غائب نظر آتے تھے۔ لیکن ایک شخص واحد جو موجوں کے تھپیڑے اور طلاطم کے ہچکولے بھی سہتا رہا اور باوجود بے سروسامانی وکثرت حوادث اپنے قوائے عقلی و ذہنی سے سکون واستقلال اور ہمت ومردی کے ساتھ کام بھی لیتا رہا وہ سید احمد خاں تھا۔

قدیم تہذیب کا احسان | سرسید خاک دہلی سے اس وقت پیدا ہوئے کہ دلی میں عظمت رفتہ کی مٹی ہوئی یادگاروں کے سوا کچھ نہ تھا اس زمین کے درخشندہ گوہر باقی نہ تھے اور اس کی آب و تاب گرد وکدورت نے خاک میں ملا دی تھی اس لئے سرسید نے اپنے بچپن میں اگر کچھ دیکھا تو حسرت ویاس کا جلوہ، اور ضلالت و گمراہی ادبار ونکبت کا تسلط، علم وعمل کی روشنی، اقبال وعروج کی نشانیاں

وہاں موجود ہی نہ تھیں کہ وہ الوالعزمی اور بلند ہمتی کی طرف رہنمائی کرتیں اور جس دائرہ میں وہ حرکت کرتے تھے اس کو جدید تہذیب اور نئی روشنی کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ لیکن اسی قدیم صحبت اور گئی گزری تہذیب کے جو آثار اُن کی سوسائٹی میں باقی تھے اس کا یہ کرشمہ تھا کہ اگرچہ سرسید کی تعلیم کمل نہ تھی۔ دولت و ثروت سے بھی محروم تھے، حکومت میں کوئی غیر معمولی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ جدید ترقیات و علوم سے مطلق بے بہرہ تھے، سیاسیات و تعلیم جدید کے اصولوں سے ناآشنائے محض تھے باایں ہمہ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے مصنف سب سے زیادہ صاحب جاہ و ثروت، حکومت کے سب سے بڑے معتمد جدید علوم کے سب سے بڑے قدر شناس اور ماہر سیاست و ماہر تعلیم قرار پائے۔

آج جدید تعلیم کے کتنے پودے ہیں جو اس تناور اور بارور درخت کا مقابلہ کرسکتے ہیں جو قدیم تعلیم اور فرسودہ تہذیب کی خاک سے اُٹھا اور جس کے سایہ عاطفت کی راحت نے ایک عالم کو گھیر لیا۔

کامل اس فرقہ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

سرسید کا حلقہ | سرسید کو یہی فخر نہ تھا کہ وہ جدید علوم و جدید تہذیب سے

ناآشنائے محض ہوکر اسکے ہادی اور بانی قرار پائے اور ایک ایسے زمانہ میں
جب کہ انقلابات عالم نے حکمائے عصر کو حیران کر رکھا تھا۔ انھوں نے
رفتار زمانہ کے رجحان کو پہچانا اور اس کے عمل میں اعانت کی بلکہ وہ اپنی
مقناطیسی کشش اور حیرت انگیز قابلیت سے ایسے افراد کو اپنے گرد جمع
کر لینے میں بھی کامیاب ہوئے جو اُن ہی کی طرح قدیم تہذیب و قدیم علوم کے
پروردہ تھے اور اپنے اپنے دائرۂ عمل میں اس منزلت و مرتبت سے بیخبر
جو بالآخر اُن کو حاصل ہونے والی تھی نسبتاً گمنامی و خود فراموشی کی
زندگی گزار رہے تھے اس انجمن کو جسے ہم سرسید کی ذات سے وابستہ
کہتے ہیں سرسید نے گویا ٹوٹے ہوئے تاروں اور بکھرے ہوے موتیوں سے
آراستہ کیا تھا۔ اور ان کو دور دور فاصلوں سے اُٹھا کر ایک جگہہ
جمع کیا تھا، محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، نذیر احمد، اور
سمیع اللہ خاں اس بزم کے آفتاب تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ سرسید کو
اس زمانہ اور اس سوسائٹی میں ان سے بہتر رفقا میسر آسکتے تھے؟
دنیا کے ہر بڑے آدمی کے پاس ایک حلقہ احباب نظر آتا ہے جو
اس کی ذات اور اس کے کام سے جس قدر ارادت و عقیدت رکھتا ہے
وہ دوسروں میں نظر نہیں آتی اور ہر بڑے شخص کی عظمت و رفعت
اور اُسکے کارناموں کی قدر و منزلت کا راز اسی حلقہ احباب میں

پوشیدہ ہوتا ہے، سرسید بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ اِن کی ارادتمندوں کے حلقہ میں جو ہستیاں نظر آتی ہیں اُن میں سے ہر ایک اپنے مخصوص دائرہ عمل میں درجہ امتیاز رکھتا ہے۔ اور بہت کم ایسے ہیں جو اس کی ہمسری کا دعوی کر سکیں۔

مختلف قابلیتں

علاوہ اِن خصوصیات کے جن میں سرسید کی ذات یگانہ نظر آتی تھی اس شخص میں اس قدر مختلف قابلیتں پائی جاتی ہیں جس کی دوسری مثال تلاش کرنا نہایت دشوار ہے، اصلاح قومی اور علوم جدیدہ کی جد جہد میں اُن کو مختلف اور بعض مرتبہ متضاد قابلیتوں کے اظہار کی ضرورت پیش آئی ہے۔ اصلاح معاشرت کی کوشش، مباحث علمی میں سرگرمی، تصنیف وتالیف، تحریر وتقریر عام مخالفت کا مقابلہ، علیگڈہ کے لئے حصول سرمایہ اور انتظامی امور کا سرانجام مثلاً تعمیرات کی نگرانی، دفاتر کا کام انجمنوں اور مجالس کا اہتمام اس قسم کے کام میں جن کو کامیابی وخوبی سے انجام دینے کے لئے مختلف قابلیتوں کی ضرورت تھی۔ سرسید میں یہ قابلیتں خداداد تھیں اور انہوں نے اُن کا ایسا عمدہ استعمال کیا ہے کہ وہ آج تک تعجب وحیرت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں اور داد وتحسین سے بالاتر معلوم ہوتی ہیں۔

تصنیف و تالیف | سر سید کو تصنیف و تالیف کے مشغلوں سے جو لگاؤ اور تعلق تھا۔ اس کی مثال اس زمانہ میں تقریباً مفقود ہے۔ باوجود ہجوم افکار و کثرت مشاغل اُن کی تصانیف کی تعداد کثیر ہے اور ان میں مذہبی، تاریخی، علمی و ادبی ہر قسم کی بلند پایہ تصانیف شامل ہیں۔ بڑا حصہ اُن مذہبی کتابوں کا ہے جن کو اُنھوں نے ایک خاص مقصد سے شایع کیا اور ایسے موضوع پر قلم اُٹھایا جس کا اس وقت تک اسلامی حلقوں میں کسی کو خیال بھی نہ گذرا تھا اور جس کی اشاعت کا ناگزیر نتیجہ مخالفت کا وہ طوفان تھا جو آخر دم تک کم نہوا۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے انھوں نے جس آسانی اور قدرت کے ساتھ ان مسائل پر داد تحقیق دی ہے اور مجتہدانہ موشگافیاں کی ہیں وہ اُن کی کم فرصتی اور مشغولیت کو دیکھتے ہوے عجیب بات معلوم ہوتی ہے پھر سفر و حضر، ملازمت و ہجوم مشاغل، دوست احباب کے جلسے اور گفتگو کوئی چیز بھی اُن کے شغل تصنیف و تالیف میں مخل نہوتی تھی اور اُن کا قلم بدستور چلتا رہتا تھا۔ سر سید کی کل تصنیفات کی تعداد ستائیس تک پہنچی ہے جس کا اجمالی تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔

اُردو | سر سید نے زبان اردو کی جو عدیم النظیر خدمت کی ہے اس کے احسان سے یہ زبان اور مسلمان قوم کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی

اُن کے زمانہ تک اردو تصنیفی زبان نہ تھی اس کو بول چال میں دخل تھا، کسی قدر مراسلت و عدالتی کاموں میں رواج ہو چلا تھا لیکن مصنفوں اور معززین شرفار کی زبان اس وقت تک فارسی ہی تھی اردو میں نہ کوئی تصنیف ہوئی تھی اور نہ اس کا استعمال عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے محض اپنے قلم سے اردو کو اس قعر مذلت سے نکال کر دنیا کی بلند رتبہ و معزز زبانوں کی برابر لا کر بٹھا دیا۔

اُن کی طرز تحریر کی خصوصیات بہت شرح و بسط کی محتاج ہیں لیکن بلا خوف تردید اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ جو روانی، شائستگی متانت، ادائے مطالب کی استعداد اور بے ساختہ پن اُن کی وجہ سے اردو کو نصیب ہوا۔ اس سے قبل کہیں نظر نہیں آتا۔ سرسید نے اصلاح زبان کے ساتھ ہی اصلاح شاعری پر بھی توجہ کی اور اپنے اثر و کوشش سے بیشمار قومی نظمیں لکھوائیں جو زبان، بندش، اور قواعد عروض کی عدم پابندی کی وجہ سے قدیم طرز شاعری سے بالکل مختلف ہیں اس مقصد میں اُن کو اس حد تک کامیابی ہوئی کہ علاوہ بیشمار نظموں کے ملک کو حالی و شبلی جیسے دو ممتاز قومی شاعر نصیب ہو گئے جن کے بعد زمانہ نے سینکڑوں قومی شاعر پیدا کئے۔

مسدس حالی جس کو قومی شاعری کی تاریخ میں خاص منزلت
و اقتدار حاصل ہے اور جو آج بھی ہمارے خزانہ علمی کا ایک درخشاں
گوہر ہے سرسید ہی کی اصلاحی کوششوں کا نتیجہ اور یادگار ہے
اس موقع پر سرسید کا وہ خط پیش کیا جاتا ہے جو انھوں نے مولانا
حالی کو مسدس کی تصنیف پر لکھا ہے، اس تحریر سے سرسید کی
بے تکلف خط و کتابت کا رنگ، اُن کے طرزِ تحریر کی جھلک،
احباب سے تعلقات کی شان اور مسدس حالی پر اُن کی رائے کا
کسی قدر پتہ چلتا ہے۔

جناب مخدوم مکرم من:

عنایت نامہ جات مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔ جس وقت
کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہو لی ہاتھ سے نہ چھوٹی
اور جب ختم ہو گئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی اگر اس
مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے
تو بالکل بجا ہے، کس صفائی اور خوبی اور روانی سے
یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے
کہ ایک ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ اور تشبیہات
دور از کار سے جو مایۂ ناز شعراء و شاعری ہے بالکل مبرا ہے

کیونکہ ایسی خوبی اور خوش بیانی اور موثر طریقہ پر بیان ہوا ہے متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں اثر کرتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اُڑایا ہے یا ادا کیا ہے، میری نسبت جو اشارہ اس نظم میں ہے اس کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ "تو کیا لایا" میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہئے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے۔

نہایت جلد آپ اِن جملہ امور سے مجھے مطلع فرمائیے اور یہ بھی
لکھیے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب موجود ہیں؟

آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو
دیا جاوے اور رجسٹری کرا دی جاوے میں دل سے تشکر کرتا ہوں
مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ
یا اُن کے ماتم کا مرثیہ ہے۔ کسی قید سے مقید کیا جائے
جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر
گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلہ سارنگی پر گاویں
قوال درگاہوں میں گاویں، حال لانے والے اس سچے
حال پر حال لاویں اُسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہو گی۔
میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں
تمام اشراف ہوں اور رنڈیاں نچواؤں مگر وہ رنڈیاں
بھی مسدس گاتی ہوں۔

میں اس کل مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھپواؤں گا
میرے اُن استفسارات کا جواب جن پر نشان درج
کر دیا ہے بہت جلد مرحمت ہو۔ خاکسار آپ کا احسان مند تابعدار
سید احمد

تقریر وتحریر | سرسید کو تقریر وتحریر کا خداداد ملکہ تھا اگرچہ یہ دونوں خوبیاں مشکل سے ایک جگہہ جمع ہوتی ہیں مگراُن کی تقریر کا اثر بھی ایسا ہی ہوتا تھا جیسا کہ اُن کی تحریری مضامین کا ہندوستان وانگلستان کے نامور وقابل اشخاص کا بیان ہے کہ وہ پیدائشی اوربیڑ (مقرر) تھے۔ جب وہ تقریر کرتے تھے تو الفاظ کی روانی اورطبیعت کا جوش اس طرح امنڈ آتا تھا کہ اُن کے چہرہ پراس کا اثر محسوس ہونے لگتا تھا اور قومی غفلت کا نوحہ کرتے وقت سننے والوں کے دلوں پر تبیر وسنان کا کام دیتا تھا اور جو اثر مجمع پر ہوتا تھا وہ لوگوں کی رنجیدہ صورتوں اور آنسوؤں کے قطروں سے ظاہر ہونے لگتا تھا جن کو ضبط کرنے کی تاب اُن میں باقی نہیں رہتی تھی۔ وہ تقریر کے لئے پہلے سے طیاری نہ کرتے تھے اور نہ تحریریں غور وفکر کے عادی تھے بلکہ بیساختہ وبرجستہ تقریر وتحریر اُن کی خصوصیات میں داخل تھے۔

اِن کی تحریروں میں مذہبی اور علمی مباحث، سیاسی مسائل قانونی تحریرات، مقدمات کے فیصلے اور بے تکلف خطوط، ادبی ورتاریخی مضامین موجود ہیں۔ اِن کا قلم ہر مضمون پر یکساں قابلیت سے چلتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ جو شوخی ادبی مضامین اور خطوط میں ہے

وہ علمی و مذہبی مباحث میں نظر آجاے یا جو متانت و صفائی عدالتی تجاویز میں ہے وہ تاریخی و سیاسی مضامین کو بے لطف کر سکے باایں ہمہ ہر رنگ میں ایک خاص پختگی نظر آتی ہے۔

اسباب بغاوت ہند، ایک سیاسی تحریر ہے اور اس کی اشاعت ایک نازک و اہم ذمہ داری تھی اس لئے اُس کا ہر ہر لفظ بچا تلا ہونا ضرور تھا۔ اس لئے طرز تحریر بیشمار پابندیوں میں مقید ہو جاتا ہے تاہم اس کی خوبی اور لطف بیان اور ادائے مطالب کی قدرت قابل داد ہے ملاحظہ ہو۔

لیجسلیٹو کونسل میں ہندوستان کے شریک ہونے سے صرف اتنا ہی نقصان نہیں ہوا کہ گورنمنٹ کو اصلی مضرت قوانین و ضوابط کی جو جاری ہوے بخوبی معلوم نہیں ہو سکے اور اغراض عام رعایا جس کا لحاظ رکھنا گورنمنٹ کے واجبات سے تھا ملحوظ نہیں رہیں، اور رعایا کو اس مضرت کے رفع کرنے اور اپنے مطلب کے پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہیں ملی، بلکہ بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ رعایا کو منشار اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورنمنٹ کا معلوم نہوا۔ اور گورمنٹ کی ہر تجویز پر

رعایا کو غلط فہمی ہوئی جو تجویز گورنمنٹ کی ہوتی تھی ہندوستانیوں کو بسبب اسکے کہ وہ لوگ اس میں شریک نہ تھے اور انکو اس تجویز سے واقف نہ تھے اس کی بنیاد معلوم نہ ہوئی اور ہمیشہ یہ ہی سمجھے کہ یہ بات بھی ہمارے ہم وطنوں کو خراب اور برباد اور ذلیل اور بے دہرم کرنے کو ہے۔..................

رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی کہ رعایا ہندوستان کی ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی اور پھر اس کو اپنے دل میں سچ سمجھتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ اگر ہم آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں اور کل ہیں تو پرسوں نہیں،.......................

(یہ) صرف اسی سبب سے تھا کہ لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستانی شریک نہ تھے ....

یہ مت کہو کہ ہماری گورنمنٹ نے چھاپہ خانوں میں سوائے گالی اور افترا اور جن باتوں سے فتنہ یا سرکشی وقوع میں آئے اور سب امورات چھاپنے کی

اجازت دی تھی اور قانون جاری ہونے سے پہلے مشہور کیا جاتا تھا اور ہر شخص کو اس پر عذرات پیش کرنے کا اختیار تھا کیونکہ یہ اُمور اُن بڑی عظیم الشان باتوں کے علاج کو جن کا ہم ذکر کرتے ہیں محض ناکافی بلکہ محض بے فائدہ تھے۔

اور ہم نہیں چاہتے کہ اس مقام پر ہم سے یہ گفتگو کی جاوے کہ ہندوستانیوں کا جو نہایت جاہل ہیں اور بے تربیت لیجسلیٹو کونسل میں شریک ہونا کس طرح ہوتا اور کیا قاعدہ ہندوستانیوں کی شرکت کا نکلتا اور اگر رعایائے ہندوستان کو مثل پارلیمنٹ کے لیجسلیٹو کونسل میں مداخلت دی جاتی تو طریقہ اُن کے انتخاب کا کیا ہوتا اور اس میں بہت سی مشکلیں پیش آتیں کیونکہ اس مقام پر ہم کو صرف اتنا ثابت کرنا ہے۔ یہ بات گورمنٹ کے لئے بہت اچھی اور پر ضرور تھی اور اسی کے نہونے کے سبب یہ فساد برپا ہوے، اور طریقہ مداخلت رعایا کی بابت ہماری علیحدہ رائے ہے اس کو دیکھنا چاہئے اور جو بحث ہو وہاں کرنی چاہئے۔

اسی طرح مذہبی تحریرات میں تحقیق، قوت استدلال اور سب سے زیادہ طرز ادا اور دل نشین پیرایۂ بیان قابل داد ہے۔ مثلاً معجزہ کی بحث میں ایک جگہہ لکھتے ہیں۔

"انہیں غلط خیال کے سبب لوگوں نے انبیاء سے انکار کیا ہے، چنانچہ قوم نوح، قوم عاد، اور قوم ثمود نے انبیاء کے انکار کرنے کی یہ ہی وجہ بیان کی کہ "اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا"۔ اور انہیں غلط خیالات کی وجہ تھی کہ مشرکین عرب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزوں کے طلب گار ہوتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ اگر یہ پیغمبر ہیں تو کیوں نہیں اِن کے پاس فرشتے آتے؟ کیوں نہیں اِن کے پاس خزانہ اُتار اگیا؟ کبھی کہتے تھے کہ یہ تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں، بازاروں میں پڑے پھرتے ہیں انسانوں سے زیادہ کوئی بات ان میں نہیں ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس مختصر میں سرسید کے عظیم الشان کام یعنی خدمت اردو کی تفصیل ممکن نہیں جو دو چار اقتباسات اُن کے مضامین تقریروں اور خطوط کے سلسلہ بیان میں آگئے ہیں وہ ہرگز اُس واقعی اہمیت کا اظہار نہیں کر سکتے جو اِن کی اس خدمت ادب

زبان اردو کو حاصل ہے۔

ذاتی صفات | سرسید جس طرح اپنی دوسری خوبیوں میں یگانۂ روزگار تھے اسی طرح اپنی ذاتی صفات میں ممتاز تھے، خلوص و محبت، اولوالعزمی و بلند نظری، استقلال و ہمت، ظرافت و شوخی، جذبۂ ایثار و ذوق خدمت تمام صفات انسانی اس ذات میں جمع تھے بقول حالی

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

اُن کی بے تکلف صحبتیں ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے ہمیشہ پر لطف رہتی تھیں اور اُن کو اپنے احباب مخلصین کے ساتھ ہمیشہ وہ تعلق رہا جو دوسروں کو اپنے قریبی عزیزوں سے بھی نہیں ہوتا کتنے ہی احباب اُن کے ایسے تھے جو باوجود اختلاف خیال اُن کے کاموں میں محض اُن کی محبت کے سبب اعانت کرتے تھے اور وہ بھی اُن سے بے تکلفی و خلوص کا معاملہ کرتے تھے جو یک دلی و یکجہتی کی انتہائی مثال ہے، زین العابدین خاں مرحوم کو وہ ہمیشہ انہیں الفاظ سے یاد کرتے تھے جو بے تکلف صحبت میں اُن کے لئے استعمال کرتے تھے مرتے دم تک یہ ہی وضع رہی۔ چنانچہ بستر مرگ سے جو خط اُن کو لکھا ہے

اس میں لکھتے ہیں "زبان کھجلاتی ہے، اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اُسکو بُرا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے۔ اور کوئی یہاں نہیں ہے۔ جس پر غصہ نکالوں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے۔ جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہوگیا۔ صبح کو اُٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔ " ایکہ ہرگز فراموشت نکنم " کا نقشہ ہوگیا ہے۔

یہ ہی حال ان کا اپنے دوسرے احباب کے ساتھ تھا۔ نواب محسن الملک سے انہوں نے جس بے تکلفی سے خطبات احمدیہ کے لئے بار بار اعانت طلب کی ہے اس کا ذکر بھی ضمناً کہیں آگیا ہے نواب وقار الملک کو اپنے ایک خط میں اسی زور اور قوت سے جو محبت و خلوص کا نتیجہ تے لکھتے ہیں۔

" آخراجات کی تنگی سب کو ہے۔ دوسروں کا حال معلوم نہیں ہوتا کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ مجھ کو بیس روپیہ دینا کس قدر مشکل ہے۔ پس ایسے ضروری کاموں کے لئے تنگی اخراجات کا عذر میں اپنے خیال کے مطابق محض مہمل سمجھتا ہوں۔ پس تم پر کیسی ہی تنگی ہو اور آمدنی اخراجات کو کافی نہ ہو اور ہر مہینے قرض ہوتا جاوے ایسے امور میں ان باتوں کی

کچھ وقعت نہیں سمجھتا ہوں دنیا کا کارخانہ اسی طرح نشستم پشتم چلا جاتا ہے۔ بجز اُن لوگوں کے جو اپنی زندگی کا مقصود گنج قارون جمع کرنا سمجھتے ہیں اور جس قدر جمع ہو جاوے اور زیادہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا مجھ کو اور تم کو ایسا نہ کرے۔

سیر چشمی | سر سید نے جن خیالات کا اظہار اس خط میں کیا ہے اسی پر وہ عمل بھی کرتے تھے۔ تمام عمر نوکری کی اور ایک عرصہ تک سید محمود ایک ہزار روپیہ ماہوار ان کو دیتے رہے، اسکے علاوہ پولٹیکل پنشن تھی لیکن یہ تمام رقوم اُن کے اخراجات کے لئے کافی نہ ہوتی تھیں اور ہمیشہ اِن کے اخراجات آمدنی سے زیادہ ہو جاتے تھے۔ قومی کاموں میں ہمیشہ حیثیت سے زیادہ چندہ دیتے تھے، مہمانداری کا بڑا خرچ تھا اور دستر خوان ہمیشہ وسیع ہوتا تھا۔

جب تک انہوں نے علیگڈھ میں مدرستہ العلوم کی بنیاد نہ رکھی تھی وہ ضرورت مندوں کی دست گیری نہایت فراخ حوصلگی سے کرتے تھے۔ زمانہ غدر کے بعد عرصہ تک اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ دہلی کے مفلوک الحال لوگوں کی امداد میں خرچ کرتے رہے۔

استقلال | سر سید کے استقلال و ہمت کی مثالیں اُن کے

مشہور و معروف کارناموں سے ظاہر ہیں لیکن عام مخالفت کا جو اثر اُن کی طبیعت پر ہوتا تھا وہ ضرور حیرت انگیز ہے ابتداءً جب اُنہوں نے اصلاحی مضامین لکھنا شروع کئے اور سفر یورپ کے حالات بغرض اشاعت بھیجے تو ہندوستان میں اُن پر سخت اعتراض ہوئے۔ سر سید کو ان اعتراضات کا ایسا ملال ہوا کہ انہوں نے سفرنامہ لکھنا بند کر دیا۔ لیکن اسکے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے اپنی مخالفت یا مخالفین کا کچھ بھی خیال کیا ہو۔ یہاں تک کہ اُن کے پاس گمنام خطوط پہنچے اور اُن میں سر سید کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں دو چار مرتبہ اُن کے احباب اور بعض ہمدردوں نے نہایت وثوق سے بیان کیا کہ آپ کی جان کا خطرہ ہے۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ ان باتوں کو ہنسی میں ٹال دیا۔

مذہب کی عزت و عظمت | سر سید کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ اُن کا مذہبی اختلاف عقائد تھا جو روشِ عام سے بالکل جدا تھا اور جس کی حمایت میں انہوں نے علاوہ تفسیر قرآن کے متعدد رسائل و مضامین لکھے ہیں۔ بعض لوگ ان کو لامذہب و دہریہ سمجھتے تھے اور بہت سے کافر و ملحد قرار دیتے تھے۔ اکثر علماے اسلام نے اُن کے کفر پر متفقہ فتوے بھی دیے ہیں۔ لیکن انہوں نے مذہبی اقتدار و عظمت کے لئے اپنی راے

کے مطابق تمام عمر کام کیا اور آخر وقت تک اس کوشش میں رہے
اِن بیشمار واقعات میں جو احترام مذہب کے متعلق اُن کی زندگی میں
ملتے ہیں ایک واقعہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے اور اس میں خود
سر سید کی شہادت موجود ہے اُن کے ایک عزیز دوست کو کسی
افسر نے جس کی ماتحتی میں وہ کام کرتے تھے نماز پڑھنے پر اعتراض
کیا تھا تھا۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"بھائی ..... کل میں سارے دن متردد رہا کیونکہ
تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم
ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی
نہیں پڑھتا، اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا
دو دو وقت کی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں ریل میں جتنا سفر ہو
مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی یہ سب باتیں مجھ میں ہیں "اور
نالائقی و شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے
مگر تم نے اس معاملہ میں جو جوش دکھایا۔ نہایت پسند کیا
نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے
خرابی سے ادا کریں یا قضا کریں لیکن اگر کوئی
شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو اس کا صبر ایک لمحہ بھی

نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی میری
سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جسکے بخشے جانے کی
توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی
میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا
تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامت اعمال سے ایسا طریقہ
اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب
ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر بلبلانا، اور گڑگڑانا
اور حضور رخصت ہی دیں۔ تنخواہ کاٹ لیں کہنا واہیات تھا
تڑاق سانی استعفے دیدینا تھا، صاف کہدینا تھا
کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی
اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسر ہوتی
فاقے مرجاتے نہایت اچھا ہوتا۔ والسلام

وضع قطع سرسید بچپن سے دہلی کی وضع میں رہتے تھے۔ گول
یا چوگوشہ ٹوپی، نیچا کرتہ اس پر صدری ٹخنوں سے اونچا مغلئی پاجامہ
گلے میں بڑا سا رومال بندھا رہتا تھا جس سے مقصود گلے کی رسولی کی
بدنمائی کا چھپانا تھا۔ لیکن جب وہ ولایت جانے لگے تو بعض انگریزوں کے
مشورہ سے ترکی ٹوپی، ترکی کوٹ اور پتلون اور بوٹ پہننے لگے۔

اس کے بعد ہمیشہ یہ ہی وضع رہی اور باوجود اسکے کہ ان کو بارہا اس کی وجہ سے تکلیف اُٹھانا پڑی لیکن انہوں نے اس وضع کو نہ چھوڑا اکثر انگریزوں سے وہ محض اس لئے نہیں ملتے تھے کہ ان کے کمرہ میں جوتہ اُتار کر داخل ہونا پڑتا تھا۔ حضور نظام کی خدمت میں جو وفد مدرستہ العلوم کا حاضر ہوا اس میں سرسید نے اس عذر سے شرکت نہیں کی کہ وہ جوتہ اُتار کر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ نواب کلب علیخاں صاحب سے وہ ملے تو اُن کو جوتہ پہنکر آنے اور کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔

لیکن ان تمام باتوں سے زیادہ موثر و قابل ذکر اُن کا جذبۂ قومی اور ولولہ خدمت تھا جس نے تمام عمر اِن کو کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے وہ ہر وقت قومی ترقی کے خیال اور حصول مقصد کے ذہن میں لگے رہتے اور جس کام پر ہاتھ ڈالتے۔ اسکو پورا کئے بغیر نہ چھوڑتے تھے۔ سرسید کا انہماک و شغف اُن کا جوش و ولولہ اُن کی عمر کے ساتھ برابر بڑھتا رہا

آثار الصنادید کی تصنیف میں سرسید نے بارہا اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا اور پُرانے کھنڈروں اور بلند مقامات کے کتبے خود جا کر حاصل کئے تبئین الکلام لکھتے وقت مہینوں رات کو پوری نیند سونا نصیب نہوا

سائنٹفک سوسائٹی کو ہزاروں روپیہ کا اپنا سرمایہ دیدیا، مذہبی تصانیف کی بدولت ایک عالم کی مخالفت گوارا کی اور قوم کی اصلاح و ترقی تعلیمی کی خاطر اپنا وطن، اپنے عزیز اپنا سارا وقت، اپنا بڑا اثاثہ سب کچھ قربان کردیا۔ اور جس عظیم الشان کام کی ابتدا کی تھی اس کو دم آخر اسی انہماک کے ساتھ کرتے رہے۔

زیستن در فکرِ قوم و مردن اندر بندِ قوم
میتوانی گر توانی سید احمد خاں شدن



۱۲۴۸۲

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ

علیگڈہ کے بعد اس صوبہ میں سب سے قدیم اور مشہور اسلامی مدرسہ ہے جہاں تعلیم ذہنی کے ساتھہ مذہبی اور جسمانی تربیت کا بھی بہترین انتظام ہے۔ ہندوستان کے ہر صوبہ کے طلبا یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ دار الاقامہ میں متعدد قابل استاد اور علماء بچوں کی نگرانی اور تعلیم و تربیت کی غرض سے اُن کے ساتھہ رہتے ہیں۔ مفصل حالات کے لئے دستور العمل طلب فرمائیے۔

محمد الطاف حسین بی اے (علیگ)

ہیڈ ماسٹر